غالب

حیات اور اردو شاعری کی تنقیدی تحسین

مُصنّفہ

ڈاکٹر سیّد عبد اللطیف پی' ایچ' ڈی (لندن)

پروفیسر انگریزی ادب جامعہ عثمانیہ مصنف "دی انفلوئنس آف انگلش لٹریچر آن اُردو لٹریچر"

مُترجمہ

سیّد معین الدّین قریشی ام' اے (عثمانیہ)

ناشر

جہاں گیر بکڈپو ۔ کھاری باؤلی ۔ دھلی

تیس روپیہ پچاس پیسے

فہرست مضامین

قیمت

دیباچہ

علمی دنیا کے سامنے اس چھوٹی سی کتاب[1] کو پیش کرتے ہوئے بطور اظہار حال دو ایک باتیں عرض کر دینی ضروری ہیں۔

جب سے کہ غالب پر میرے چند مضامین (جو یہاں باب اول، چہارم اور پنجم کے تحت درج ہیں) ہندوستانی جرائد میں شائع ہوئے ہیں، اردو داں طبقوں میں ایک سنسنی سی پیدا ہو گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض حضرات ایسے بھی موجود ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے ظنیات اور غیر معتدل مدحت سرائی کے خلاف ایک حق بجانب صدائے احتجاج

[1] اصل کتاب بزبان انگریزی ۱۹۲۸ء میں طبع ہوئی تھی۔

بلندگی ہے لیکن اور احباب مجھ سے اس بناء پہ ناراض ہیں کہ اس کتاب
کے لکھنے سے میرا مقصد اس ہستی کو بالارادہ مطعون کرنا یا اس کا رتبہ گھٹانا
ہے جس کو وہ دنیا کے عظیم الشان شاعروں میں شمار کرتے رہے ہیں ان
حضرات نے میری مکمل تصنیف کے مطالعہ اور اصل نتائج کی جانچ
سے پہلے یہ رائے قائم فرمائی ہے! سنا ہے کہ بعض حضرات
یہ بھی پوچھتے ہیں کہ آخر مجھے غالب پہ قلم اٹھانے کا کیا حق حاصل
ہے کیونکہ ان کی رائے میں میں نے اردو کے دامن میں پرورش
نہیں پائی بلکہ جنوبی ہند کی محض ایک غیر تربیت یافتہ بولی، دکھنی
کا آغوش یافتہ ہوں میں جانتا ہوں کہ وہ حضرات جو میرے اس
حق کا سوال اٹھائے ہیں اپنے مضامین میں اردو زبان و ادب
کے کسی نہ کسی پہلو کی تائید میں، گریرسن اور ٹلل کے اقتباس پہ
اقتباس بے تکلفی کے ساتھ دیے جاتے ہیں اور اس کو باعث
افتخار سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مجھے یقین کامل ہے کہ ان میں نہ تو
گریرسن اور نہ ٹلل ازراہ مروّت و اخلاق بھی یہ کہہ سکتے ہیں
کہ وہ کم از کم اس بولی کے آغوش یافتہ ہیں جس میں میں نے
آنکھیں کھولیں۔"

اردو ادبی تنقید ان دنوں اسی قسم کے نقادوں کی تختۂ مشق

بنی ہوئی ہے۔ جو دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ مقدس ویدوں کے علاوہ ہندوستان میں اگر کوئی الہامی کتاب ہے تو وہ دیوان غالب ہے اس زمانے سے جس میں سے چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا ، مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا ، والا ترانہ تفنن وجود میں آیا ، دیوانہ وار افراد کی یہ برادری روز بروز بڑھتی ہی گئی اور ادبی رائے زنی کے احساس تناظر کا گلا گھونٹتی رہی۔ اپنی چار دیواری میں بیٹھ کر یہ حضرات اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اردو ادب ابھی عالم عنفوان میں ہے وہ ابھی عبوری دور میں ہے اور شباب کی منزل مقصود کی طرف جادہ پیما لیکن عنفوان سے شباب اور شباب سے پختگی تک پہنچنا دور کی بات ہے۔ غالب جیسے غزل گو شعرا جو اپنی زمین پہ آسمان ہی بن کر کیوں نہ چمکے ہوں آتے اور جاتے رہیں گے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ غالب پہ اردو شاعری کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ ابھی ہمیں ایسے بلند پایہ شاعر اور نوع انسانی کے غمگسار محسنین پیدا کرنے ہیں جو زندگی کے اس احساس ہم آہنگی کو جس پہ میں نے اس کتاب کے چھٹے باب میں خصوصیت کے ساتھ زور دیا ہے ، جو ہر اعلیٰ شاعری کا لازمی عنصر ہے ہم میں بسا دیں گے اور ذہن انسانی کو " حسین پیکروں کی جلوہ

گاہ " بنا دیں گے۔

یہ ایک ادبی احتیاج ہے جس کی اہمیت کو واضح کرنے کی اس حقیر کتاب میں کوشش کی گئی ہے۔ کاش میرے افراد قوم اس پہ غور فرمائیں۔

" میں کچھ دور کا منظر دیکھنا نہیں چاہتا "
" ایک ہی قدم میرے لئے کافی ہے "

میں نے بعض لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا ہے کہ مشرقی شاعری کو مغربی معیار پہ جانچنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا میں نے غالب کی تحسین میں واقعی کوئی اجنبی معیاروں سے کام لیا ہے، کیا در حقیقت ایسے کوئی معیار موجود بھی ہیں؟ زندگی اور خصوصاً انسانی زندگی سارے عالم میں اصلاً ایک ہی ہے۔ البتہ اس کا اظہار ہر مرد اور عورت میں انفرادی طور پہ بدلتا رہتا ہے۔ اس لئے کہ جس قسم کی روح ہو گی اظہار بھی اسی نوعیت کا ہو گا۔ بالخصوص سرودی شاعری میں۔ یہی وہ روح ہے جو ہر مرد یا عورت کے احساس و کیفیت کے پس پردہ کار فرما رہتی ہے قبائے ظاہری یعنی الفاظ کے رسمی پردہ کو چاک کر دیجئے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہر زبان کی موزونیت کے لحاظ سے قوانین لفظیات کا سوال پیدا ہوتا ہے، تو آپ کو

وہ روح نظر آجائے گی جو ظہور کے لئے بے تاب تھی۔ یہ روح ایک سرچشمہ سے جنم لیتی ہے۔ اور ہر فرد میں اس کے اپنے ظرف نور کے لحاظ سے چمکتی ہے۔ یہی وہ ظرف ہے جس سے جمالی ظہور کے میدان میں ایک شخص کا درجہ متعین کیا جاتا ہے۔ خواہ اس شخص کا تعلق مشرق سے ہو یا مغرب سے۔

آخر میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ باب سوم کی تیاری میں جو غزلیات غالب کی تاریخی ترتیب سے بحث کرتا ہے۔ میں نے دیوان غالب کے اس نسخہ سے بہت مدد حاصل کی جو ۱۲۳۷ھ سنہ ۱۸۲۱ء کا لکھا ہوا ہے۔ سرکار رجھوپال نے ازراہ فیاضی مجھے یہ نسخہ مستعار عنایت فرمایا تھا۔ میں اس موقع پر

ٹ یہ نسخہ دیوان غالب کی تاریخ و ارتدوین میں میرے لئے بہت کار آمد ثابت ہوا۔ دیوان مذکور اس وقت زیر طبع ہے اور عنقریب شائع ہو جائیگا۔

سرکار موصوف کا سپاس گزار ہوں۔ نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کا دلی شکریہ بھی مجھ پہ فرض ہے، جن کے حسن توسط سے مجھے یہ نسخہ حیدرآباد میں دستیاب ہوا۔

جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد دکن
سنہ ۱۹۲۸ عیسوی

سیّد عبداللّٰہ لطیف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

تمہید

اُردو دیوان غالب جس کو خود غالب نے مرتب کیا تھا کوئی اٹھارہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ بظاہر یہ ایک مختصر سا سرمایہ ہے جو اگر دوسرے بلند پایہ شعرا کے کلام کے مقابل رکھا جائے تو اور بھی کم مقدار معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود موجودہ نسل نے غالب کو جو درجہ دے رکھا

ہے وہ کسی اور اردو شاعر کو نصیب نہیں۔
غالب کے سن وفات یعنی ۱۸۶۹ء سے اب تک کئی تنقید نگاروں نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اردو شاعری میں اس کا کیا حصہ ہے بعضوں نے محض رسمی طریقہ پر کام کیا اور ایسے الفاظ میں "طفلانہ حیرت" کا اظہار کیا جو "شرمندہ معنی" نہ ہوے یا شاعر کے اسلوب اور طرز سخن کی لفظی موشگافیوں میں گم ہو گئے۔ کسی نے بھی اس کی روح میں سما جانے اور اس کے شاعرانہ احساس و فکر اور تخیل کی خصوصیت کو جانچنے کی کوشش نہیں کی۔ تنقید نگاروں کے اس گروہ نے زیادہ تر اُن لوگوں کو بہ چایا جن کی تعلیم ایک حد تک قدیم طرز پر ہوئی ہے اور جن کے ذوقِ حسن شناسی پر مغربی ادبیات کی پرچھائیاں نہیں پڑیں مگر گنتی کے چند افراد ایسے بھی ہیں جنھوں نے ان رسمی تنقید نگاروں کی بہ نسبت زیادہ وسیع مقاصد کے ساتھ اپنا کام شروع کیا۔ مولانا الطاف حسین حالی اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں ان حضرات کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا کہ دوسروں کے مقابلہ میں ان کا کام زیادہ اہم اور سنجیدہ ہے اور کلام غالب کا محقق کبھی کبھی مدد اور رہنمائی اور بسا اوقات بنی بنائی رائے کیلئے ان کا دامن پکڑتا ہے۔
حالی اور بجنوری غالب کے سمجھنے میں اپنے علم و فضل کو تو خوب

سمجھا گئے، لیکن خود غالب کے ذہن و کمال کی مکمل تصویر نہ کھینچ سکے۔ ڈاکٹر بجنوری کی "محاسن کلام غالب" حالی کی "یادگار غالب" کے کئی سال بعد شائع ہوئی۔ بجنوری مرحوم مشرق و مغرب دونوں کے ادبی نصب العین سے واقف تھے اس لئے وہ غالباً حالی سے زیادہ اس بات کی اہلیت رکھتے تھے کہ جدید علمی اصول پہ غالب کا حق تحسین ادا کریں لیکن "محاسن" کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی قوت فیصلہ کمال جوش و عقیدت کا شکار ہو گئی۔ بھلا وہ نقاد پڑھنے والے کے دل میں کیا اعتماد پیدا کر سکتا ہے جو اپنی کتاب کا آغاز ہی اس حیرت انگیز قول سے کرتا ہے "ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں۔ مقدس وید اور اردو دیوان غالب۔"

اس طرح کے قول فیصل سے فوراً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ نقاد کو اصول تناظر کا کوئی احترام نہیں۔ یہ نقش ہر اس شخص پہ بیٹھتا ہے جو بجنوری کی پرجوش گردش قلم کا آخر وقت تک ساتھ دیتا ہے۔ غالب جو بھی ہی سب سے اول ایک غزل گو شاعر تھا اس کے تغزل کی خصوصیات معلوم کرنے کے لئے دوسروں سے مقابلہ کرنا ایسا ہی ناگزیر سمجھا گیا تو صحیح طریقہ یہ تھا کہ اسی میدان کے اور شعراء کو لے لیا جاتا نہ یہ کہ اپنے ہیرو کی خاطر مغربی حسن کاری اور فلسفہ و ادب کے ان تمام مشاہیر کا خاکہ اڑایا جائے جن سے

وہ واقفیت رکھتے ہیں جیسے رے فیل، رو بنس ورجل، ارسطو، گیٹے، ہام بیر، میلارمے، رمبو، میادموزل دی مو بان، ویرلین میٹرلنک، ایبسن، شیکسپیر، ورڈس ورتھ، کانٹ، ہیگل، اسپائینوزا، بیکن، بارکلے، ڈاروِن، والس، لاپلاس، اسپنسر، منڈل، دیزمن، لاج ہرشل، فخنے اور برگ ساں۔

ناموں کی شاندار صف آرائی نے غالب کی خصوصیات ذہن وکمال کے سمجھنے میں مدد دینے کے بجائے اگر کچھ کیا تو صرف اسی قدر کہ ان کو اور بھی دھندلکے میں ڈال دیا شاعر کے نمایاں محاسن ومعائب کو دکھاکر اس کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنیکی کوشش ہی نہیں کی اسکے علاوہ جرمن اور فرانسیسی اقتباسات سے موازنہ یا مقابلہ کرکے جب غالب کی خوبیاں ہی دکھانا مقصود تھا تو قارئین کے افادہ کے لئے ان کا ترجمہ بھی ضروری تھا کیونکہ قارئین کی غالب تعداد ان زبانوں سے ناواقف ہے۔ بجنوری کے اس طویل مطالعہ کے بعد بھی ایک شخص اسی الجھن میں مبتلا رہتا ہے کہ آخر غالب کی شاعرانہ عظمت کا مدار کس چیز پر ہے۔

لہ ۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۰۔ تصنیف راقم الحروف " ادب انگریزی کا اثر اردو ادب پر " فر امسٹر گرام لمیٹیڈ ۔ لندن ۱۹۳۴ء ۔

حالی کی یادگار غالب گو نسبتاً ضخیم ہے لیکن اس میں ادعائی شان بہت کم پائی جاتی ہے بجنوری کی طرح وہ ڈرامہ نویسوں، رزمیہ نگاروں اور فلسفیوں کے جھرمٹ میں دیوانہ وار نہیں بھٹکتے بلکہ ایک خاص قابل فہم مسلک اختیار کرتے ہیں۔

اپنے دیباچہ میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ غالب کو سمجھنے کے دو طریقہ ان کے ذہن میں آتے ہیں ایک طریقہ تو یہ ہے کہ (۱) ان کے اصناف کلام سے ایک معتدبہ حصہ نقل کیا جاتا۔ (۲) جو کلام نقل کیا جاتا اس کی لفظی اور معنوی خوبیاں نزاکتیں اور باریکیاں بیان کی جاتیں شعرا کے جس طبقہ میں مرزا کو جگہ دی جانی چاہئے اس طبقہ کے شاعروں کے کلام سے مرزا کے کلام کا موازنہ کیا جاتا ان کی غزل سے مرزا کی غزل کو قصیدہ سے قصیدہ کو اور اسی طرح ہر صنف سے اسی صنف کو ٹکرایا جاتا۔"

حالی اس کو عمدہ طریقہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس بنا پر ٹال جاتے ہیں کہ یہ طریقہ دشوار گزار اور انکے زمانہ کے لئے غیر مفید ہے وہ یہ بیان کرنے کی زحمت نہیں گوارا کرتے کہ آخر یہ طریقہ کس لئے دشوار گزار اور غیر مفید ہے۔

ایک نقاد کو اور خاص کر اس شخص کو جو کوئی حقیقت بیان کرنا اور عام مذاق کی اصلاح کے لئے کوئی پیغام سنانا چاہتا ہے اپنے

دل کی بات بتا دینی لازمی ہے۔ ساری خدائی اگر اس کو نہ سمجھ سکے تو
کیا مضائقہ خدا کے چند بندے بھی کان دھر کر سن لیں تو دل کی مراد پوری
ہوگئی۔ کوئی نصب العین یا تو ایک آن کی بیساختہ لہر ہوتا ہے یا مسلسل
کاوشوں کا نتیجہ وہ ایک طرح کی مخلوق ہے اور اسی لئے اس کی پرداخت
ضروری ہے۔ دبا دبا کر اس کا گلا گھونٹنا گناہ کا ارتکاب کرنا اور انسانی
فتحمندیوں سے انکار کرتا ہے بہر حال حالی کا "عمدہ طریقہ" کوئی ایسا عمدہ
نہیں معلوم ہوتا" ہر صنف کے اشعار کا بہترین طریقہ نقل کر دینا، لفظی اور
معنوی خوبیاں نزاکتیں اور باریکیاں بیان کرنا، شعراء کے جس طبقہ میں مرزا
کو جگہ دینی چاہیئے اس طبقہ کے شاعروں کے کلام سے مرزا کے کلام کا موازنہ
کرنا، ان کی غزل سے غزل کو قصیدہ سے قصیدہ کو اور اسی طرح ہر صنف
سے اسی صنف کو ٹکرانا" حقیقت میں مضمون کو توڑنا ہے اس طریقہ سے
شاعر کی جیتی جاگتی تصویر جلوہ گر نہیں ہوتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ
غالب کے "پرزے اڑائے جا رہے ہیں" اس سے کوئی مربوط اور
مسلسل اثر پیدا نہیں ہوتا حالی کا دوسرا طریقہ جو انہوں نے یادگار غالب
میں اختیار کیا ہے موضوع کو تین حصوں میں منقسم کر دینا ہے۔ پہلے
حصہ میں غالب کے واقعات زندگی ہیں۔ دوسرے میں نظم و نثر کے
انتخاب ہیں جنکا موازنہ ایران کے مسلم الثبوت شعراء سے کیا گیا ہے

تیسرے کے متعلق یہ تبلایا گیا ہے کہ اس میں غالب کی حیات، شاعری اور اصول پر ایک مختصر سا تبصرہ ہے۔

راقم الحروف نے نہایت ہی کھلے دل سے اس طریقہ کے نتائج کی جانچ کی اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ حالی کے اس "عمدہ طریقہ" کے مقابلہ میں جس کو انہوں نے خوش قسمتی سے ترک کردیا اس قدر غیر علمی نہیں لیکن یہ بھی اپنا نشانِ منزل کھو بیٹھتا ہے۔ پہلے ہی حصہ کو لیجئے جس میں غالب کے واقعات زندگی کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس میں زندگی کے واقعات نہ تو تاریخ وار بیان کئے گئے ہیں اور نہ ترقی وار۔ ان سے غالب کے ذہن و کمال کے نشوونما اور ارتقاء پہ کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ تاریخوں کے بیان کرنے میں کسی ایک سنہ کی پابندی نہیں کی گئی۔ کہیں سنہ عیسوی لکھدیا گیا ہے اور کہیں سنہ ہجری ان کے بیان کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

(۱) ولادت (۱۲۱۲ھ) اور خاندان (۲) ابتدائی تعلیم و تربیت (۳) سفر کلکتہ (جو ۳۰ سال کی عمر میں پیش آیا) تاریخ ندارد (۴) وظیفہ لکھنو تاریخ ندارد (۵) زبان کی دو مشکلات (۶) دہلی کالج کی فارسی پروفیسری مرزا کی خدمت میں پیش کی گئی سنہ ۱۸۴۲ء (۷) قید سنہ ۱۲۶۴ھ (۸) غالب کا تعلق بہ حیثیت درباری مورخ کے سنہ ۱۲۶۶ھ (۹) اصلاح شعر بہادر شاہ (۱۰) سفر کلکتہ

کا ایک واقعہ (۱۱) اولاد (۱۲) مرثیۂ عارف (۱۳) غدر (۱۴) وظیفہ رام پور (۱۵) قاطع برہان (۱۶) مرزا کی استعداد علمی۔ عربی، فارسی، عروض، تصوف، تاریخ، اور شعر خوانی وغیرہ (۱۷) اخلاق (۱۸) مروت (۱۹) عالی حوصلگی (۲۰) حافظہ (۲۱) شعر فہمی (۲۲) حسن بیان (۲۳) خودداری (۲۴) خوراک (۲۵) آموں کی رغبت (۲۶) اسلام کا یقین (۲۷) بہادر شاہ اور مذہب تشیع (۲۸) انکسار (۲۹) سلامتیٔ طبع (۳۰) داد سخن (۳۱) انصاف (۳۲) تقریظ لکھنے کا ڈھنگ (۳۳) صداقت پسندی (۳۴) ناقدردانی کی شکایت (۳۵) عجز کا اقرار (۳۶) ہجو سے احتراز (۳۷) خانگی تعلقات (۳۸) وفات۔

غالب کی زندگی کا یہ مرقع پڑھنے والے کے دل پر کوئی متحد اور مربوط نقش نہیں بیٹھا سکتا۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں غالب کی شاعری کا اندازہ لگایا گیا ہے لیکن بحث یہاں بھی فرداً فرداً ہر جزو سے کی گئی ہے چند صفحات اس کے لئے وقف کر دئے گئے ہیں کہ جستہ جستہ اشعار سے اس کی خصوصیات کلام ظاہر کی جائیں جو حالی کی رائے میں یہ ہیں۔ تازگی مضمون، طرفگی خیال، جدت تشبیہ و استعارہ، معمولی الفاظ میں لطیف خیالات کو ظاہر کرنے کی

قدرت اور فخر و مباہات جو اس عصر کا ایک عام رنگ تھا۔
اس کے بعد حالی چلتے چلتے رک جاتے ہیں چنانچہ خود فرماتے ہیں :۔

" اگرچہ مرزا کی اردو شاعری پہ بحث کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ گنجائش باقی ہے لیکن چونکہ لوگوں کو ایسی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے اس لئے ہم اس بحث کو یہاں ختم کرتے ہیں اور صرف اس بات پہ اکتفا کرتے ہیں کہ مرزا کے دیوان ریختہ میں جس قدر اشعار سرسری نظر میں ممتاز معلوم ہوں وہ بطور انتخاب کے یہاں نقل کر دئے جائیں ...... اور جہاں ضرورت ہوگی اس شعر کے معنی بھی بتلائیں گے اور کہیں کہیں محاسن شعری کے متعلق بھی اشارہ کیا جائیگا۔"

اس اچٹتے انداز میں غالب کا سب سے مقبول سوانح نگار اس مسئلہ کی تمام الجھنوں سے اپنا دامن چھڑا لیتا ہے حتی کہ یادگار کے آخری حصہ میں بھی جس کو وہ اپنی تصنیف کی جان سمجھتے ہیں خود غالب کی جان سخن پہ متوجہ نہ ہو سکے۔

حالی کی اس قدر محنت و کاوش کے بعد بھی پڑھنے والا روح روان غالب کو نہیں پا سکتا کیونکہ بے ربط جزوی مباحث اور غالب کے دل کے

ٹکڑوں کو الگ الگ بتانے سے اس کے شاعرانہ کمال کی صحیح تصویر ہمارے آنکھوں کے سامنے نہیں آسکتی۔

"یادگارِ غالب" کے قارئین کو یاد ہوگا کہ حالی نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ مشاہیر شعرائے فارس سے غالب کا موازنہ کرکے اس کے پایۂ شاعری کا تعین کرتا ان کی تنصیف کا نمایاں پہلو ہوگا۔ لیکن یہ مسئلہ جب عملی طور پر ان کے سامنے آتا ہے تو دامن بچا کر نکل جاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ اس موقع پر مرزا کی چند غزلوں کا موازنہ اُن سب لوگوں کی غزلوں سے کیا جاتا جن کی غزل پر مرزا نے اپنی غزل بلکہ تمام شاعری کی بنیاد رکھی یعنی نظیری، عرفی، ظہوری، طالب، اور اسیر وغیرہ لیکن اس مختصر کتاب میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ (یہ یاد رہے کہ یادگارِ غالب تقریباً ۳۹۱ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے)[1] نیز عام طبائع کو اس قسم کی تدقیقات سے کوئی دل بستگی بھی نہیں معلوم ہوتی اس لئے یہاں مرزا کی صرف دو غزلوں کا مقابلہ نظیری اور ظہوری کی غزلوں سے کہ اس وقت ان دونوں کے دیوان ہمارے پاس موجود ہیں، کیا جاتا ہے۔ نظیری کی جو مشہور غزل پا خفتہ است و بلا خفتہ است ہے مرزا صاحب نے بھی اس پر غزل لکھی ہے نظیری کی غزل نوبیت کی ہے

---

[1] "یادگارِ غالب" کریمی پریس لاہور صفحہ ۲۴۲۔

جس میں سے ایک شعر پڑھا نہیں گیا اور مرزا کی غزل بارہ بیت کی ہے اس لئے مرزا کی غزل میں سے بھی اوّل صرف آٹھ بیتیں لیجائیں گی تاکہ ٹھیک ٹھیک موازنہ ہو سکے۔

غضب ہے کہ غالب کے شاعرانہ کمال کا اندازہ ان آٹھ اشعار سے کیا جاتا ہے جو کسی اندرونی جذبہ سے بیچین ہو کر نہیں لکھے گئے بلکہ تقلید و فرمائش اور ذہنی مشق کا نتیجہ ہیں۔ اس موازنہ کی ایک عجیب بات یہ ہے کہ مقابلہ کے تمام اشعار میں شاید ہی کوئی شعر ہم مضمون نکل آئیں بحر و ردیف و قافیہ کے سوا کوئی چیز ان میں مشترک نہیں پائی جاتی۔"

حالی و بجنوری دونوں کے طرز تنقید میں ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ ایک آدھ شعر سے وہ یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ غالب ہئیت داں اور فلسفی، واعظ اور عاشق سبھی کچھ تھا۔"

ایک اور نقاد ڈاکٹر سید محمود بیرسٹرایٹ لا میں بھی یہی رجحان بدرجہ اتم پایا جاتا ہے جو بدایونی نسخہ کے دیباچہ میں غالب کو ہندوستانی قومیت کا اوتار بنا دیتے ہیں۔ اس طرز کی تنقیدوں سے اردو داں طبقہ میں ایک قسم کی بد ذوقی پیدا ہو چلی ہے۔ یہ بات اس لئے زیادہ قابل افسوس ہے کہ پرانی روشنی کے افراد میں یہ مذاق اس قدر رچا ہوا نہیں ہے جس قدر کہ جدید علمی مرکزوں میں پایا جاتا ہے جہاں اردو ادب

کی تحقیق و تدقیق سے بے پروائی برتی جاتی ہے اور معلم و متعلم زیادہ تر اوروں کے (جیسے حالی و بجنوری) پڑھائے ہوئے سبق کو دہراتے رہتے ہیں اگر ہماری یونیورسٹیوں میں بطرز جدید غالب کا صحیح اندازہ لگانے کی کوشش کی بھی جاتی ہے تو نقادان فن کے لئے سخن شناسی سے زیادہ یہ امر پیش نظر ہوتا ہے کہ شاعر کے دستار سخن پہ اپنے اپنے لوایجاد طرے لگائیں۔

غالب پرستی کی لیئے اب اس درجہ بڑھ چلی ہے کہ اردو ادب کی خاطر غالب کے ذہن و کمال کو صحیح طور پہ جانچنے کی کوشش (اگر ممکن ہو تو متفقہ طور پہ) ازبس ضروری ہے۔

یہ کام نہایت مشکل ہے۔ غالب کے واقعات زندگی منضبط حالت میں موجود نہیں۔ مکاتیب جس سے تقریباً تمام مواد دستیاب ہوا تاریخ وار مرتب نہیں حالانکہ کئی ہندوستانی جامعات کی اعلیٰ جماعتوں میں وہ داخل درس ہیں ان میں بہت سے خطوط ایسے بھی ہیں جن پہ کوئی تاریخ درج نہیں۔ دیوان سے جس کو غالب نے مرتب کیا اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ کون سی غزل کب اور کس اصول میں لکھی گئی ان حالات میں غالب کا مطالعہ بہت ہی دشوار

اور کٹھن ہو جاتا ہے پھر بھی اگر قوت فیصلہ سے کام لیا جائے تو عجب نہیں کہ موجودہ نسل غالب کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ سکے ۔



باب دوم

مواد اور اسکی فراہمی

کلام غالب کے محقق کا سب سے پہلا کام مواد کی فراہمی ہے مواد عموماً دو قسم کا ہوتا ہے "ماخذ" اور "رہنما" "ماخذ" یا تو مستقل اور معین ہوتے ہیں جیسے کسی صاحب قلم کی تصنیفات، یا اضافی جن سے اس کے زیر غور کارناموں پہ روشنی پڑتی ہے جیسے مصنف کے عہد یا اس کے بعد کی تحریرات اور زبانی روایتیں۔ "رہنما" کی بھی دو قسمیں ہیں پہلی قسم میں ان مختلف اصناف ادب کی تاریخیں داخل ہیں جن میں مصنف نے عموماً طبع آزمائی کی ہو نیز اس قومی تہذیب کی تاریخیں جن کے زیر اثر مصنف کی نشو و نما ہوئی۔ "رہنما" کی دوسری قسم جوہر شناسی کے گر (جیسے تاریخ جمالیات) اور ادبی تنقید کے وہ اصول سمجھاتی ہے جو ادبی ظہور کا مذاق رکھنے والی اقوام میں عہد بہ عہد بنتے رہے ہیں۔

شاعری

اب سوال یہ ہے کہ کلام غالب کے مطالعہ کے لئے کس قسم کا مواد ہماری دسترس میں ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے ہماری نظر دیوان غالب پر پڑتی ہے جس کو خود غالب نے اپنے اصلی دیوان سے انتخاب کر کے مرتب کیا اور اس کی زندگی ہی میں شائع ہوا۔ اصل دیوان اب کہاں ہے اور یہ انتخاب کب کیا گیا اس کا پتہ نہ تو غالب کے مطبوعہ خطوط سے چلتا ہے اور نہ اس کے کسی سوانح نگار یا نقاد سے۔ خود غالب کے یہاں اپنے دیوان کا کوئی مکمل نسخہ موجود نہیں تھا[1]۔ البتہ اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اس کے ایک دوست نواب ضیاء الدین خاں کے ہاں اس کا کلام وقتاً فوقتاً جمع ہوتا رہا[2]۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی کے ایک شہزادہ نے اپنے لئے اس کی ایک کاپی تیار کروائی تھی لہذا یہ امر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو جب انتخاب کلام کی ضرورت پیش آئی ہوگی تو اس نے انہی دو نسخوں میں سے کسی ایک کی طرف رجوع کیا ہوگا۔ یہ نسخے اگر واقعاً اب موجود ہیں تو ان کا پتہ لگانا مستحسن

---

[1] اردوئے معلیٰ۔ کریمی پریس لاہور ص ۲۸۲ ۔ [2] اردوئے معلیٰ۔ کریمی پریس لاہور ص ۲۸۲

دشوار ہے۔ اُن کے متعلق غالب کا تو یہی بیان ہے کہ وہ ہنگامۂ غدر میں تلف ہو گئے۔ یہ بھی نہیں معلوم کیا جا سکتا کہ انتخاب کا پہلا نسخہ اب کہاں ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ ۱۸۵۵ء میں منتخبہ دیوان کا ایک نسخہ خود غالب نے نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے لئے خاص طور پہ تیار کرایا تھا۔ اور عجب نہیں کہ یہی سب سے پہلا نسخہ ہو۔ اس انتخاب کی بھی کوئی ذاتی کاپی غالب کے یہاں موجود نہیں تھی۔ کیونکہ غدر کے بعد اس کے ایک دوست ممتاز علی کو عظیم الدین نامی ایک شخص نے منتخبہ دیوان کے شائع کرنیکا خیال پیدا ہوا تو اس کے لئے غالب کو ضیاء الدین خاں کے پاس کے ایک نسخہ سے نقل لینی پڑی۔ غالب کا اصلی منتخبہ کلام چونکہ غدر میں ضائع ہو چکا تھا اس لئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ نسخہ بھی اسی رام پوری نسخہ کی ایک نقل[1] ہوگا۔ موجودہ مواد سے اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ آیا عظیم الدین نے یہ دیوان شائع کیا بھی یا نہیں بہر حال یہ یقینی ہے کہ ۱۸۶۱ء میں احمدیہ پریس دہلی نے اس کا ایک اڈیشن شائع کیا[2,3]۔ اور بہت ممکن ہے کہ دوران طباعت میں خود غالب نے اس کے پروف صحیح کئے ہوں

۱؎ اردوئے معلیٰ کریمی پریس لاہور ص ۲۶۹ ۔ ۲؎ اردوئے معلیٰ۔ کریمی پریس لاہور ص ۲۸۲

۳؎ دیوان غالب نظامی پریس بدایون ۱۹۲۳ء دیباچہ اشاعت دوم۔

بہر حال غالب کے منتخبہ دیوان کی سب سے پہلی اشاعت یہی معلوم ہوتی ہے اور بعد کی تمام اشاعتیں اسی کی نقلیں۔

اس طرح محقق کے لئے یہی رام پوری نسخہ غالب کے اردو کلام کی ایک مستند "کتاب آخریں" کا حکم رکھتا ہے جس میں شاعر "یاران نکتہ داں" کو "صلائے عام" دے رہا ہے۔ اس کے ساتھ محقق کو یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اصلی کتاب کی کون سی چیزیں اس نے قلم زد کر دیں تاکہ وہ اس کی شاعری پہ ایک جامع نظر ڈال سکے۔

اس کے لئے محقق کو تمام و کمال بھوپالی نسخہ پہ تکیہ کرنا پڑے گا جو کہا جاتا ہے کہ فوج دار محمد خان بھوپال کے لئے ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء میں لکھا گیا تھا[1]۔ اس وقت غالب کی عمر صرف ۲۴ سال کی تھی۔ یہ نسخہ کتب خانہ حمیدیہ بھوپال میں محفوظ ہے۔ جس کی نقل ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کے مقدمہ محاسنِ کلام غالب کے ساتھ آگرہ سے شائع ہوئی تھی[2] اس اڈیشن میں جو نسخہ حمیدیہ کے نام سے موسوم ہے

---

[1] اس ضمن میں ملاحظہ ہو مضمون مصنف بعنوان "دیوان غالب قلمی ۱۲۳۷ھ" مسلم ریویو کلکتہ نمبر۔ ۱۹۲۹ء جس کا ترجمہ مسٹر سید محمد۔ ایم۔ اے۔ مولف ارباب اردو نے مجلہ مکتبہ حیدرآباد کے جلد ۲ شمارہ ۶ میں شائع کیا ہے۔

[2] سن اشاعت درج نہیں ہے۔

بھوپالی نسخہ کے تمام اشعار کے علاوہ ایسا کلام بھی اضافہ کر دیا گیا ہے جو نسخہ مذکور میں تو نہیں پایا جاتا۔ لیکن منتخبہ دیوان کی اور اشاعتوں میں موجود ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کے مرتب اس بات کے مدعی ہیں کہ یہ نسخہ کئی مرتبہ دہلی بھیجا گیا تاکہ ۱۸۲۱ء کے بعد کا کلام اس میں شامل ہوتا رہے اور ایسے تمام اضافہ شدہ اشعار قلمی نسخہ کے حاشیہ پر موجود ہیں۔[1] جو مرتب کے خیال میں بلحاظ انداز تحریر و طرز تصحیح غالب ہی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں[2] جو صاحب اصل مسودہ پر کام کرنا چاہیں انہیں ان بیانات کی تصدیق ذاتی نقد و نظر سے کرنی ہوگی جیسا کہ راقم الحروف کو کرنا پڑا (اس کا اندازہ تاریخ وار دیوان غالب کے ضمیمہ نمبر۱ کے ملاحظہ سے ہو سکتا ہے) اصل نسخہ پر کئی جگہ خود جدار محمد غوث خاں کی مہر (۲٫۶ سمر × ۲٫۸ سمر) ۱۲۴۸ھ لگی ہوئی ہے اسی نام کی ایک ایک مہر جو ذرا بڑی ہے (۸٫۵ سمر × ۵٫۴ سمر) اول و آخر کے ان سادہ صفحات پر موجود ہے جو اصل نسخہ کے کاغذ سے قسم میں مختلف ہیں اور جو بعد کے لگائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اس مہر میں ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۴ء) لکھا ہوا ہے لیکن ان دلائل کی بنا پر جو متذکرہ ضمیمہ نمبر۱ میں بیان کئے گئے ہیں یہ سنہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اب ہم یہ نتیجہ نکال

---

[1] نسخۂ حمیدیہ صفحہ ۵ تا ۶۔ [2] نسخۂ حمیدیہ صفحہ ۵ تا ۶۔

سکتے ہیں کہ اس نسخہ میں ۱۸۳۲ء تک کا کلام موجود ہے لیکن ضروری نہیں کہ یہ اس زمانہ کے سارے کلام پر حاوی ہو۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ نسخہ دیوان کی ترتیب سے پہلے کون سا کلام قلم زد ہوتا رہا بھوپال اور رامپور کے نسخوں کا مقابلہ ضروری ہے۔ اگر یہ معلوم ہو کہ ۱۸۲۱ء کے قبل کا کچھ کلام ایسا ہے جو بھوپالی نسخہ کے متن میں تو موجود ہے لیکن ۱۸۵۵ء کے رامپوری نسخہ میں نہیں پایا جاتا تو ایسے کلام کو ایک علیحدہ عنوان کے تحت جمع کر لینا چاہیئے یہ وہ کلام ہوگا جس کو غالب نے آگے چل کر اس بنا پر خارج کر دیا کہ وہ اس کے شایان شان نہیں اس

لہ بدایونی نسخہ کے مرتب مسٹر نظامی بدایونی تیسری اشاعت کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس کی تیاری کے وقت ان کے ہاں دیوان غالب کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا جس کو شاعر نے ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) میں مرتب کیا تھا۔ اس نسخہ کو حاصل کرنے کی میں نے کوشش کی لیکن وہ بار ور نہیں ہوئی۔ نظامی صاحب کا ارشاد ہے کہ وہ نسخہ مفقود ہے۔ بہر حال اگر یہ پھر دستیاب ہو جائے اور اصلی ثابت ہو تو کلام کی مزید ترتیب میں بڑی مدد ملے گی۔ موصوف کی اصل عبارت کے لئے اس کتاب کا ضمیمہ نمبرا ملاحظہ ہو۔

کلام سے غالب کے ابتدائی دس سال (۱۸۱۱ء تا ۱۸۲۱ء) کے طرز سخن کا حال معلوم ہوگا جو بعد میں یا تو بالکلیہ خارج کر دیا گیا یا اس میں ترمیم و اصلاح کی گئی ۔

دوسرا مقابلہ شدنی حصہ کلام وہ ہے جو ۱۸۲۱ء اور ۱۸۳۲ء کے درمیان موزوں ہوتا رہا اور جو بھوپالی نسخہ کے حاشیہ پر درج ہے۔ ان میں سے جو اشعار رامپوری نسخہ میں حذف کر دیئے گئے ان کے لئے حذف شدہ اشعار کا ایک اور علیحدہ عنوان قائم ہوگا۔

رام پوری نسخہ کے ان اشعار کو جو بھوپالی نسخہ میں نہیں پائے جاتے درحقیقت ۱۸۳۲ء تا ۱۸۵۵ء کے دور سے منسوب کرنا چاہیئے۔ یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ رام پوری نسخہ کی ترتیب کے وقت اس دور کے کون سے اشعار حذف کر دیئے گئے کیونکہ دیوان کا اصلی نسخہ اب ناپید ہے۔ یہ غالب کی پختگی عمر کا زمانہ تھا اس لئے قیاس یہی چاہتا ہے کہ اس موقع پر بہت تھوڑا حصہ خارج کیا گیا ہوگا۔ محقق کو اگر غالب کی مجموعی تحقیق منظور ہو اور حالی اور بجنوری کی طرح صرف اپنی پسند کے اشعار پہ اندازہ لگانا کافی نہیں سمجھتا ہے تو اس کو کلام غالب کے دو حصہ کرنے پڑیں گے پہلے میں وہ اشعار آئیں گے جو حذف کر دیئے گئے اور دوسرا ان اشعار پہ مشتمل ہوگا جو آخر تک برقرار رہے۔ عجب نہیں کہ غالب کا اور کلام ابھی پردہ

گم نامی میں پڑا ہو یہ اگر ہاتھ لگ جائے تو اس سے وہ مطلق ماخذ مکمل ہو جاتے ہیں جو کلام غالب کے مطالعہ کے لئے ضروری ہیں۔

نثر

غالب کی اُردو نثر جس سے اس وقت ہمارا قریبی تعلق ہے زیادہ تر ان خطوط پر مشتمل ہے جو اس نے اپنے احباب کو لکھے لیکن ہمیں اس کے فارسی کے نثری کارناموں کو جن میں فارسی مکاتب بھی شامل ہیں نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ان سے اس کی ذہنی قابلیتوں اور واقعات زندگی پر روشنی پڑتی ہے خطوط غالب کا پہلا مجموعہ اس کی وفات کے سال اردوئے معلی[1] کے نام سے شائع ہوا۔ بعد میں ان خطوط کی کئی اشاعتیں طبع ہوئیں اور ہر اشاعت میں نئے نئے خطوط شامل ہوتے رہے۔ سب سے بڑا مجموعہ ۱۹۲۶ء میں لاہور سے شائع ہوا[2]۔

ان خطوط سے سوانح غالب کا معتد بہ مواد حاصل ہوتا ہے۔ غالب

---

[1] دیباچہ اردوئے معلیٰ از میر مہدی مجروح جو ۱۹۲۶ء کے لاہور والے نتیجہ خطوط غالب میں بھی شائع ہوا ہے۔ صفحہ ۱ و صفحہ ۲۴

[2] کریمی پریس لاہور۔

عام طور پر خطوکتابت میں دوستوں سے اپنی داستان حیات بیان کرجاتا تھا جس کے منظر عام پر آنے کا خیال بھی بعض اوقات اس کے پیش نظر ہوتا تھا لیکن اس آپ بیتی میں چونکہ شاعرانہ رنگ غالب ہے اس لئے واقعات زندگی کی چھان بین اور ان کی صحت کے امتحان میں محقق کو نہایت احتیاط برتنی چاہیئے۔ مثال کے طور پر اسی مسئلہ کو لیجئے کہ ملا عبدالصمد نے غالب پر اوائل زندگی میں کیا اثر مترتب کیا۔ اس اثر کی نوعیت کے متعلق ہمارے ہاں حالی کی شہادت موجود[1] ہے۔ اور خود غالب ابتدائی تحریروں میں اپنے استاد کے احسانات کا اعتراف کرتا[2] ہے۔ لیکن جب بڑی عمر کو پہنچتا ہے تو یہ کہکر اس احسان سے مکر جاتا ہے کہ اس نے سب کچھ مبداء فیاض سے حاصل کیا[3] اور مشہور ایرانی استاد سرے سے وجود ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ ان اہل ظاہر کی لطف فریبی کے لئے عالم خیال کا تراشا ہوا ایک پیکر تھا جو کسی بے استادے کے جوہر کمال کو نہیں مانتے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

" مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں اور عبدالصمد ایک

---

[1] یادگار غالب۔ کریمی پریس لاہور ص ۹۹ ۔ [2] یادگار غالب۔ کریمی پریس لاہور ص ۱۲

[3] یادگار غالب۔ کریمی پریس لاہور ص ۶۳

فرضی نام ہے چونکہ مجھ کو بے استاد کہتے تھے اُن کا منہ بند کرنےکو میں نے فرضی استاد گڑھ لیا ہے۔"

خود ستائی جو شاعرانہ تعلّی کے بھیس میں ہو بھلی ضرور معلوم ہوتی ہے بشرطیکہ اس میں واقعی کوئی لطافت و شعریت موجود ہو۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اسے سمجھئے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے
ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں — دیکھیں کہدے کوئی اس سہرے سے بڑھکر سہرا

مذکورہ بالا اشعار میں تعلّی کا جو رنگ جھلک رہا ہے وہ ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ مشرق والوں کا یہ ایک قدیم شیوہ ہے اور اس سے عام طور پر کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا پھر بھی ہم یہ جانتے ہیں کہ آخری شعر نے غالب کو کس طرح تکلیف میں مبتلا کر رکھا تھا بہر نوع اس قسم کی شاعرانہ تعلیوں کا ہرگز یہ منشا نہیں ہونا چاہئیے کہ حقیقت پر پردہ ڈالا جائے اور اگر عبدالصمد والے معاملہ کی طرح ایسا کیا جائے تو محقق کو بھی ہشیار ہونا چاہئیے۔ شاعرانہ نزاکت سے ہٹ کر اس کو یہاں تاریخی نقطۂ نظر سے غور کرنا پڑیگا۔

جن ماخذ کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ "مطلق" یا "معین" ماخذ ہیں دوران تحقیق میں ان کے متعلق اور بھی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جن کا ذکر آئندہ اوراق میں موقع بموقع آئیگا ان ماخذ کے علاوہ جن سے

جمالی مواد یا سماجی مواد حاصل ہوتا ہے، اور اضافی ماخذ کا الگ پتہ لگانا ہے۔ ایک صاحب کمال کو اپنے کمال کے ظاہر کرنے اور عصر حاضر پر اپنی شخصیت کا نقش بٹھانے میں بسا اوقات مروجہ مذاق کے خلاف جانا پڑتا ہے اور اس کی بات کے سمجھنے میں لوگ عموماً ٹھوکر کھاتے ہیں۔ غالب کے دوست بھی تھے اور دشمن بھی اس لئے ان کی رایوں پر غور کرتے وقت ان امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اضافی ماخذوں میں ایک ماخذ ہم عصری ادب ہے۔ اس ضمن میں ہم کو اس ادب پر بھی نظر رکھنی چاہیئے جو غالب کی قاطع برہان مطبوعہ ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء) کے باعث وجود میں آیا یہ بھی دیکھنا پڑیگا کہ قاطع قاطع " "مؤید برہان" "محرقِ قاطع" "ساطع برہان" کے علاوہ جن کا ذکر حالی نے کیا ہے اسی قسم کا اور ادبی سرمایہ بھی دستیاب ہو سکتا ہے یا نہیں، حالی کا خیال ہے کہ آپس کی سب دشتم سے بالآخر اس جدلی ادب کا سلسلہ رُک گیا۔ یہ سرمایہ باوجود مشہور ثقالت و کراہت کے شاعر کے ان ذہنی اور اخلاقی پہلوؤں پر روشنی ڈال سکتا ہے جو خود اس کی اور تحریرات میں صاف طور نمایاں نہیں ہو سکتے۔

لہ یادگار کریمی پریس لاہور صفحہ ۸۰

غالب سے جن احباب کی خط و کتابت رہی ان کا دائرہ خاصہ وسیع تھا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ ان خطوط کا کیا حشر ہوا؟ دہلی اور لکھنؤ کے دربار علمی جد و جہد کے مرکز تھے۔ ان مقامات کے مصنفین کی تصنیفات یا ان مصنفین کی باہمی خط و کتابت میں ممکن ہے کہ غالب کا بھی کچھ نہ کچھ ذکر آتا رہا ہو۔ کلکتہ میں غالب کی ادبی خصوصیات پہ جو ناگوار بحث چھڑ گئی تھی اس نے بیچارہ کے سفر کو تلخ ہی بنا دیا تھا[1]۔ اس بحثا بحثی میں جو ادب پیدا ہوا اس سے بھی بہت کچھ کا لیا جا سکتا ہے گالی گلوچ اور سب و شتم سے بھرے ہوئے گمنام خطوط خاص کر قاطع برہان کی اشاعت کی وجہ سے اس کے پاس بہت آتے رہے، کیا ان خطوط کا پتہ چلایا جا سکتا ہے؟ اس کی وفات پہ اخبارات میں نوٹ بھی شائع ہوئے ہوں گے کیا ان کی فراہمی ممکن ہے؟ غالب کو ہندوستانی قومیت کا اوتار بنانے کی کوشش کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت برطانیہ کی مزاج داری سے وہ بے پرواہ نہیں رہا جس شخص کی آنکھوں نے دہلی کے اجڑنے اور بہادر شاہ جیسے مربی کی جلا وطنی کے عبرتناک تماشے دیکھے اس کا قلم علم برداران برطانیہ کے قصیدہ خوانی

---

[1] یادگار کریمی پریس لاہور سنہ 19

میں بھی مصروف نظر آتا ہے۔ کیا یہ قصائد ہمیں کوئی بات سمجھا سکتے ہیں؟
کیا اس خط و کتابت کا بھی کھوج لگایا جا سکتا ہے جو ہمارے شاعر اور
حکومت برطانیہ کے نمائندوں میں ہوئی؟ اس قسم کی تمام چیزوں سے مزید ماخذ
کا کام لیا جا سکتا ہے جن میں کچھ تو "مطلق" ہوں گے اور کچھ "اضافی"

ایک سچا محقق غالب کے مواد کو اس وقت تک ہاتھ نہیں لگا سکتا
جب تک کہ وہ ضروری ساز و سامان سے آراستہ نہ ہو لے۔ یہ سوال کہ دنیا کے
شاعروں میں غالب کا کیا درجہ ہے ادب کے مہمات مسائل سے ہے جس
کے لئے سنجیدہ تحقیق علمی کی ضرورت ہے ظاہر ہے کہ یہ کام ہر پڑھے لکھے
آدمی کے بس کا نہیں اس میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہر محقق کا کم سے کم یہ فرض
ہونا چاہیئے کہ وہ ادبی تنقید کے اصول اور اس قوم یا سوسائٹی کی تہذیبی
تاریخ سے واقف ہو جائے جس کا غالب ایک فرد تھا۔ اس کو ان سخنوروں
کی نمایاں خصوصیات شعر سے بھی واقف ہونا پڑے گا جن سے، بقول حالی
اور خود غالب، اس کی غزل گوئی متاثر ہوئی مثلاً بیدل، نظیری، عرفی،
ظہوری، شیخ علی حزیں، طالب آملی، اور میر تقی۔ اس مقصد کے لئے جو فہرست
تیار کی جائے گی اور جو یقیناً خاصی طویل ہو گی "رہنما" کہلائیگی۔

باب سوم

مواد اور اس کی تاریخی ترتیب

"مطلق ماخذ" جن کی تفصیل پچھلے باب میں آ چکی ہے، تاریخی لحاظ سے مرتب ہونے ضروری ہیں۔ اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو غالب کے ذہن و کمال کے ارتقار کے متعلق جو بھی رائے ظاہر کی جائے گی وہ ایک ہوائی چیز ہو گی۔

حالی جیسے افراد کو جنھیں غالب سے ذاتی طور پہ شرف تقرب حاصل تھا اور جو خود عالم تھے، شاعر سے ہر غزل کی ٹھیک تاریخ نہیں تو کم از کم یہ تو معلوم کر لینا چاہیئے تھا کہ کون سی غزل پہلے کہی گئی اور کون بعد، اس طرح تمام غزلوں کی ترتیب معلوم کی جا سکتی تھی لیکن موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ اب ہم ان کی تاریخوں کے معین کرنے کی امید ہی نہیں کر سکتے ایک بات البتہ اب بھی ہمارے بس میں ہے کہ اس کے تمام اردو کلام کو

ارتقائی ترتیب کے لحاظ سے مختلف حصوں میں مرتب کر دیں[1]۔

زندگی کی رفتار ترقی اس میں شک نہیں کہ روزمرہ ہی کے واقعات پر مبنی ہوتی ہے لیکن نمایاں رجحانات روز روز نہیں بدلا کرتے اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو غالب کے کلام کی ایسی تقسیم جو بلحاظ تاریخی ارتقا ر مختلف ادوار حیات کو ظاہر کرنے، اس کے ذہن و کمال کے ارتقاء کی تحقیق میں مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بہتر شہادت کے عدم موجودگی میں اس سے زیادہ ہو بھی نہیں سکتا۔ غالب کے روزمرہ افکار و اعمال کا معلوم کرنا اگرچہ بہت سے لوگوں کی دردسری کا باعث ہوگا لیکن یہ بجائے خود ایک دلچسپ چیز ہے۔ بہرحال ادبی تنقید کیلئے کام کی بات تو یہی ہے کہ اس کا ذہن کس طرح نشو نما پاتا رہا اور مختلف دوروں اور منزلوں میں اس کے جلوے کس طرح ظاہر ہوتے رہے اسی کے مدنظر ہم ذیل میں اس کے کارناموں کی تاریخی ترتیب کا ایک ممکن طریقہ پیش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے اس کی شاعری کو لیجئے۔ خود غالب کا بیان ہے کہ پندرہ سال کی عمر سے اس نے شعر کہنا شروع کیا[2]۔ پہلے دس سال کی

---

[1] ملاحظہ ہو دیوانِ غالب جس کو مصنف نے تاریخی لحاظ سے مرتب کیا ہے۔ [2] نسخہ حمیدیہ صفحہ ۲۴۔

کا وشیں نسخہ بھوپال کے متن میں موجود ہیں جو ۱۲۳۷ھ (مطابق ۱۸۲۱ء) کا لکھا ہوا ہے جبکہ غالب کی عمر چوبیس سال کی تھی ۔ اس طرح یہی نسخہ ہمارا نقطۂ آغاز قرار پاتا ہے ۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ ۱۸۲۱ء کے بعد کا کلام ۱۸۲۱ء تا ۱۸۳۲ء کے درمیان بھوپالی نسخہ کے حاشیہ پر اضافہ کیا گیا ۔ اس طرح اس نسخہ کے دو حصے قرار دیئے جا سکتے ہیں ۔ پہلے حصہ میں وہ کلام آئیگا جو متن میں موجود ہے اور دوسرا حصہ اس کلام پر مشتمل ہوگا جو حاشیہ پر درج ہے پہلا حصہ غالب کی ادبی زندگی کے ابتدائی دس سال یعنی ۱۸۱۱ء تا ۱۸۲۱ء سے متعلق ہوگا اور دوسرا ۱۸۲۲ء تا ۱۸۳۲ء سے ۔

وہ کلام جو بھوپالی نسخہ میں تو نہیں پایا جاتا لیکن رامپوری نسخہ میں موجود ہے ۱۸۳۲ء تا ۱۸۵۵ء کے دور سے منسوب کیا جا سکتا ہے ۔

۱۸۵۵ء کے بعد بھی غالب نے شعر کہے ہوں گے لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہو سکتی کیونکہ زندگی کے آخری سال گہری شاعرانہ مصروفیت کے سازگار نہیں ہو سکتے تھے ۔ "مہر نیمروز" کی تیاری نے اس کو ۱۸۵۰ء کے

ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ۲۸ ۔ اس کے ساتھ یادگار غالب مطبوعہ کریمی پریس لاہور ۱۹۲۴ء ص ص ۷۰ و ۸۰ ملا کر پڑھئے جہاں حالی صاحب نے غالب کی اردو شاعری کی ابتدا کا حال لکھا ہے ۔

غدر تک مصروف رکھا۔ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کے درمیان جیسا کہ خود غالب کا بیان ہے غزل کی طرف اس کی طبیعت مائل ہی نہیں ہوئی۔

"قصیدے میں نے دو لکھے ہیں ایک اپنے مربی قدیم جناب فریڈرک اڈمنسٹن صاحب بہادر کی تعریف میں اور ایک جناب منٹگمری صاحب کی مدح میں ایک پچیس بیت کا اور ایک چالیس بیت کا۔ اور پھر فارسی۔ ان کو ریختہ کی غزل میں کیا چھاپو گے جانے بھی دو۔ رہیں غزلیں سابق کی وہ جو میرے ہاتھ آتی جائیں گی بھجواتا جاؤں گا۔ میاں تمہاری جان کی قسم نہ میرا اب ریختہ لکھنے کو جی چاہتا ہے نہ مجھ سے کہا جائے اس دو برس میں صرف وہ پچیس شعر بطریق قصیدہ تمہاری خاطر سے لکھ بھیجے تھے سوائے اس کے اگر کوئی ریختہ کہا ہوگا تو گنہگار بلکہ فارسی غزل بھی واللہ نہیں لکھی صرف دو قصیدے لکھے ہیں۔ کیا کہوں کہ دل و دماغ کا کیا حال ہے۔"[1]

۱۸۵۹ء کے بعد بھی غالب اردو میں نئے شعر لکھنے کی طرف مائل نظر نہیں آتا۔ اس دور کی سنجیدہ کوشش صرف اس کی فارسی مثنوی "ابر گہربار" ہے ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء کا دور نمایاں طور پر شعر سے زیادہ نثر کا دور رہا کیونکہ اسی زمانہ میں اس کے خطوط کی زیادہ تعداد لکھی گئی۔

---

[1] اردوئے معلیٰ لاہور ۱۹۲۶ء صفحہ ۲۷۵۔

اردو شاعری سے جو تھوڑا بہت لگاؤ اس کو باقی رہ گیا تھا۔ وہ اس کے شاگردوں اور قدردانوں کے اشعار کی اصلاح میں ظاہر ہوتا رہا۔

عمر کے آخری ایام میں جو کلام موزوں ہوا اس کا بہت کم حصہ روشنی میں آیا ہے اس دور کو ۱۸۵۶ء تا ۱۸۶۹ء سے متعلق کرنا چاہئے۔

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ۱۸۱۱ء تا ۱۸۲۱ء کے دور کی کئی غزلیں اور اشعار غالب نے اپنے کلام کے آخری انتخاب کے وقت (تقریباً ۱۸۵۵ء میں جبکہ رامپوری نسخہ مرتب ہوا) خارج کر دی تھیں۔

ایسے اشعار ضروری نہیں کہ سب سے قدیم ہوں۔ وہ اس دور کے آخری ایام سے بھی متعلق ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی یقین کے ساتھ نہیں بیان کی جا سکتی۔ بہرحال ہم ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ۱۸۱۱ء تا ۱۸۲۱ء کی پیداوار ہیں جن کو غالب نے اپنی شان سے بعید سمجھ کر خارج کر دیا تھا۔ غالب کی پختگی عمر کے رنگ سخن کو پیش نظر رکھ کر یہ بات البتہ ایک حد تک وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان میں اس کی ادبی سرگرمی کے پہلے دس

لہ ملاحظہ ہو دیوان غالب جس کو راقم الحروف نے تاریخ وار مرتب کیا ہے۔

سال کی کمزوریاں ضرور موجود ہیں۔

پہلے دس سال کا کلام جو رامپوری نسخہ میں برقرار رکھا گیا ہے اس سے یا تو اس کے ابتدائی طریقۂ اظہار کے اصلی ہیجانات ظاہر ہوتے ہیں یا شاعرانہ اظہار کی ذہنی مشق یا فرمائشی شعر و غزل گوئی کی قابلیت معلوم ہوتی ہے۔ یہ آخری دو پہلو ہم نے اس لئے پیش کئے کہ غزل گو شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے ذاتی احساسات ہی کا اظہار کرے جیسا کہ کتاب کے آخری باب میں بیان کیا گیا ہے۔ بہر صورت اس حصہ کلام کو غالب کے ارتقاء شاعری کی پہلی منزل سمجھنا چاہئے

دوسرے حصہ کلام پر بھی جو بھوپالی نسخہ کے حاشیہ پر درج ہے اور جو ۱۸۲۱ء تا ۱۸۳۲ء کے دور سے منسوب کیا گیا ہے یہی صادق آتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ :۔

۱۔ کلام غالب کی پہلی قسط وہ ہے جو بھوپالی نسخہ کے متن (۱۸۲۱ء) میں موجود ہے۔

۲۔ دوسری قسط ان اشعار کی ہے جو بھوپالی نسخہ کے حاشیہ پر درج ہے اور جو ۱۸۲۲ء تا ۱۸۳۲ء کے دور پر حاوی ہیں۔

۳۔ تیسری قسط ان اشعار پر مشتمل ہوگی جو بھوپالی نسخہ میں موجود نہیں ہیں اور صرف رامپور والے نسخہ میں پائے جاتے ہیں اس کو

اس کو ۱۸۳۳ء تا ۱۸۵۵ء سے منسوب کرنا چاہئے۔

۴۔ چوتھی قسط ۱۸۵۶ء تا ۱۸۶۹ء کے دور سے متعلق ہوگی۔ اس طرح مختلف تدریجی ادوار حسب ذیل ہیں۔

(۱) ۱۸۱۱ء تا ۱۸۲۱ء — ۱۱ سال کا دور

(۲) ۱۸۲۲ء تا ۱۸۳۲ء — ۱۱ سال کا دور

(۳) ۱۸۳۳ء تا ۱۸۵۵ء — ۲۳ سال کا دور

(۴) ۱۸۵۶ء تا ۱۸۶۹ء — ۱۴ سال کا دور

غالب کے ذہن و کمال کے نمود و ارتقا کا پتہ لگانے کے لئے محقق کو حسب ذیل ترتیب سے اس کے کلام کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔

متعلقہ دور	متعلقہ دور کا وہ کلام جو رام پوری نسخہ میں برقرار رہا	متعلقہ دور کا وہ کلام جو رام پوری نسخہ سے خارج کر دیا گیا۔
۱۔ ۱۸۱۱ تا ۱۸۲۱	۱۸۱۱ .... ۱۸۲۱	تا ۱۸۲۱
۲۔ ۱۸۲۲ تا ۱۸۳۲	۱۸۲۲ .... ۱۸۳۲	تا ۱۸۳۲
۳۔ ۱۸۳۳ تا ۱۸۵۵		
۴۔ ۱۸۵۶ تا ۱۸۶۹		

۱۸۱۱ء تا ۱۸۳۲ء کا وہ کلام جو رام پوری نسخہ میں برقرار رکھا گیا اس کا مطالعہ اسی دور کے اس کلام کی روشنی میں کرنا پڑے گا

جو نسخہ مذکورہ میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس مطالعہ سے جو نتائج اخذ ہوں گے وہ اس کی پختگی عمر یعنی ۱۸۳۳ء تا ۱۸۵۵ء اور مابعد کے کلام کے مطالعہ کی بنیاد قرار پائینگے۔

نثر

پہلے ذکر آ چکا ہے کہ غالب کی اردو نثر زیادہ تر اس کے خطوط ہی پہ مبنی ہے جو خطوط کہ شائع ہو چکے ہیں[1] وہ ۱۸۵۲ء تا ۱۸۶۹ء کے دور پہ حاوی ہیں اور اگر حالی کے بیان کو مان لیا جائے تو ان خطوط کو ۱۸۵۰ء تا ۱۸۵۱ء پہ بھی حاوی ہونا چاہیئے۔[2] لیکن ان دو سال کے خطوط کا پتہ ان خطوط میں نہیں چلتا پھر بھی ممکن ہے کہ بعض وہ خط جن پہ تاریخ نہیں ہے ۱۸۵۰ء تا ۱۸۵۱ء کے زمانہ کے ہوں۔

---

[1] اردوئے معلیٰ کریمی پریس لاہور ۱۹۲۶ء۔ [2] یادگار لکھنؤ اڈیشن صفحہ ۱۲۹۔۔

یہ تمام خطوط سوانحِ غالب کی بعض تفصیلات کی تعئین یا توضیح میں ہمارا بہت ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ محقق کی آسانی کے لئے اس باب کے آخر میں ایک نقشہ دیا گیا ہے جس میں مکتوب الیہم کے نام، خط و کتابت کی مدت اور مکاتیب کی تعداد بتلائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کل اتنے ہی خطوط تھے جو غالب نے ان لوگوں کے نام لکھے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کے علاوہ اور کسی سے اس کی خط و کتابت نہیں رہی۔

نقشہ کے ملاحظہ سے واضح ہوگا کہ شایع شدہ خطوط کے حسب ذیل دور معین کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔	۱۸۵۲	تا	۱۸۵۶	۵ سال
۲۔	۱۸۵۷	تا	۱۸۵۸	۲ سال
۳۔	۱۸۵۹	تا	۱۸۶۳	۵ سال
۴۔	۱۸۶۴	تا	۱۸۶۹	۶ سال

ان میں غالب تعداد ایسے خطوط کی ہے جن کے آخر میں اس کا نام یا دستخط موجود ہیں لیکن بعض پہ یہ نام و نشان نہیں پائے جاتے۔ محقق پہ اس دوسری صنف کے خطوط کے مستند یا غیر مستند ہونیکی ضروری تحقیق لازمی ہے۔

۱۸۵۲ء تا ۱۸۵۶ء کا دور غدر سے متصل پچھلے پانچ سال پر حاوی ہے اس دور کے خطوط کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کی نوعیت سے ظاہر ہوگا کہ شاعر کی زندگی کے یہ سال بے معرکہ ہے۔ صرف یہی ایک واقعہ اس دور میں نمایاں نظر آتا ہے کہ بہادر شاہ کا درباری مورخ مقرر ہوتا اور "مہر نیمروز" تصنیف کرتا ہے۔ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کا زمانہ اس کی زندگی کے انتشار کا زمانہ ہے غدر کا طوفان اٹھا تو غالب بھی اس کی زد سے نہیں بچ سکا۔ پنشن اور خلعت کے بند ہونے اور اسی قسم کے واقعات کا جن خطوط میں ذکر آیا ہے وہ اسی دور سے متعلق ہیں۔

وہ خطوط جن میں پنشن اور خلعت کی بحالی پر خوشی کا اظہار کیا گیا جو اردو دیوان اور کلیات اردو کی اشاعت سے متعلق ہیں اور جو دوستوں اور قدردانوں کی مالی امداد (جس میں رام پور اور الور کی پنشنیں بھی شامل ہیں) کے شکریہ میں لکھے گئے یہ سب کے سب ۱۸۵۹ء تا ۱۸۶۳ء کے دور کے ہیں۔ یہ دور مالی حیثیت سے اس کے چین و آرام کا دور تھا۔

۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۹ء کا دور جو اس کی وفات پر ختم ہو جاتا ہے طویل علالت اور جسمانی تکلیف کا دور تھا۔ جو خطوط کہ زندگی کے ان آخری ایام کی

کہانی سناتے ہیں وہ سب سے آخر گروپ کے تحت آتے ہیں۔

متذکرہ بالا ترتیب کے ساتھ جو محقق، مکاتیب غالب کی تاریخی تدوین کرنا چاہیں انہیں تاریخ زدہ خطوط کے الگ کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ بعض خطوں پر صرف دن یا مہینہ لکھا ہوا ہے اور بعض پر تو یہ بھی نہیں ہے ایسے خطوط کی ترتیب مختلف ادوار کے تحت کس طرح انجام پا سکتی ہے۔

اس بارہ میں صرف اندرونی شہادت ہی ہماری رہبری کر سکتی ہے۔ یہ خطوط یا تو ایسے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو بلحاظ مضمون کسی نہ کسی دور سے متعلق کئے جا سکتے ہیں یا وہ ایسے معمولی واقعات کو ظاہر کرتے ہیں جو ہر مرد یا عورت کی کسی منزل حیات میں واقع ہو سکتے ہیں آخر الذکر صورت کی یہ دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"کیوں صاحب ہم سے خفا ہو گئے کہ ملنا بھی چھوڑا۔ خیر میری تقصیر معاف کرو اور اگر ایسا ہی گناہ عظیم ہے کہ کبھی نہ بخشا جائیگا تو وہ گناہ مجھ پر ظاہر کر دو تاکہ میں اپنے قصور پر اطلاع پاؤں۔ برخوردار بھیرا سنگھ تمہارے پاس پہونچتا ہے اور یہ تمہارا دست گرفتہ ہے۔ رہتک میں تم نے اسے نوکر رکھوا دیا تھا خیر وہاں کی صورت بگڑ گئی اب یہ غریب بہت تباہ ہے

اور امور معاش میں سخت دل تنگ، تم ہی دست گیری کرو تو یہ سنبھلے ورنہ اس کا نقش ہستی صفحۂ دہر سے مٹ جائیگا۔

والسلام۔"

عنایت کا طالب

غالب

" بندہ پرور۔ آپ کا خط لکھنؤ سے آیا حالات معلوم ہوئے۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ کیا کام آپ کے سپرد ہوا ہے۔ یہ بھی لکھئے۔ چند روز صبر کرو وطن میں ہوتے تو دس بیکاری میں گھر کی خبر کیا لیتے۔ جس طرح جب گزرتی ہے اب بھی گزر جائیگی بلکہ تمہارا خرچ کم ہو گیا بہرحال ابھی اضافہ کے واسطے نہ تم لکھو نہ میں لکھوں۔ دو چار مہینے کام کرو اس میں اگر بلگرام میں چھاپہ خانہ جاری ہو گیا تو استعفاء دے کر چلے جاؤ۔ یہاں بعد چند روز اضافہ ہو نا بھی تو خیر امکان سے باہر نہیں۔"

اس قسم کے خطوط کوئی سوانحی اہمیت نہیں رکھتے اور یہ ہیں بھی تعداد میں بہت تھوڑے یہ زیادہ سے زیادہ غالب کی نثر نگاری کے اسلوب پہ

روشنی ڈال سکتے ہیں۔

اب اول الذکر صورت یعنی بلا تاریخ کے خطوط کو لیجے جو اپنی اندرونی شہادت کی نوعیت کے لحاظ سے کسی نہ کسی دور سے متعلق کئے جا سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر شیو نارائن کے موسومہ خط مورخہ ۳ مئی ۱۸۶۰ء کو لیجے جو شاعر کے دیوان کی اشاعت سے بحث کرتا ہے[1]۔

"بھائی مصطفیٰ خاں صاحب کے ہاں اترا وہاں منشی ممتاز علی صاحب دوست قدیم مجھکو ملے۔ انہوں نے کہا کہ اپنا اردو کا دیوان مجھکو بھیجئے گا عظیم الدین ایک کتاب فروش اس کو چھاپا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ مجھے یہی کہتے بن آئی کہ اچھا دیوان تو میں ضیاء الدین خاں سے لیکر بھیجدوں گا مگر کاپی کی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں نے کہا کہ میں اب کہو کہ میں کیا کرتا دلی آکر ضیاء الدین خاں سے دیوان لیکر ایک آدمی کے ہاتھ نواب مصطفیٰ خاں کے پاس بھیجدیا۔"

اب یوسف مرزا کے خط کا اقتباس ملاحظہ کیجئے جس پر کوئی تاریخ درج نہیں[2]۔

---

[1] اردوئے معلیٰ لاہور ۱۹۲۶ء صفحہ ۲۸۱ و ۲۸۲۔ [2] اردوئے معلیٰ لاہور ۱۹۲۶ء صفحہ ۲۴۷۔

"میرا اردو کا دیوان میرٹھ کو گیا۔ سکندر شاہ لے گئے، مصطفےٰ خاں دے آئے۔ ڈاک میں اس کی رسید آ گئی۔"

خط کا مضمون بتلاتا ہے کہ یہ متعلق ہے ۱۸۶۲ء سے۔ وہی سنہ جو مذکورہ بالا شیو نارائن والے خط پہ درج ہے۔ اسی طرح نواب ضیاء الدین خاں کا وہ خط بھی جو بلا تاریخ ہے (جس کا اقتباس درج ذیل ہے) اسی سال سے منسوب ہونا چاہیئے۔[1]

"جناب قبلہ و کعبہ۔ آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے۔ روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا بغیر اس کے دیکھے آپ کو کھانا ہضم نہیں ہوتا یہ بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے ایک جابہ قرار جلد بن جائے میرا کلام شہرت پائے میرا دل خوش ہو۔ تمہاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں۔ تمہارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے۔ اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں۔ رہا کتاب کے تلف ہو جانے کا اندیشہ یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہو گی احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنؤ کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً اسپیل ڈاک رام پور جاؤں گا اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔"

---

[1] اردوئے معلےٰ صفحہ ۲۱۵ و ۲۱۶۔

یوسف مرزا کے موسومہ ایک اور خط کا اقتباس ملاحظہ ہو جو بلا تاریخ ہے

"حکام صدر ایسی باتوں پہ نظر نہ کریں گے میں نے سکہ کہا نہیں اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں اور گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرع معاف نہ ہوں۔"

مضمون سے ظاہر ہے کہ یہ ۱۸۵۸ء کا خط ہے جبکہ اس فرمان شاہی کے ذریعہ جو ہندوستان کا منشور اعظم کہلاتا ہے عام معافی کا اعلان کیا گیا تھا۔

اس طریقہ پہ عمل پیرا ہو کر اندرونی شہادت کی رہنمائی میں کئی بے تاریخ خطوط (جو غالب کی زندگی کے کسی نہ کسی مسلّمہ واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں) ان مختلف ادوار کے تحت رکھے جا سکتے ہیں جن کا تعین نقشہ منسلکہ میں کیا گیا ہے۔

اردو مکاتیب غالب

نشان سلسلہ	نام مکتوب الیہ	دورۂ کتابت: قبل ۱۸۵۰ء	۱۸۵۱ء	۱۸۵۲ء	۱۸۵۳ء	۱۸۵۴ء	۱۸۵۵ء	۱۸۵۶ء	۱۸۵۷ء	۱۸۵۸ء	۱۸۵۹ء	۱۸۶۰ء	۱۸۶۱ء	۱۸۶۲ء	۱۸۶۳ء	۱۸۶۴ء	۱۸۶۵ء	۱۸۶۶ء	۱۸۶۷ء	۱۸۶۸ء	۱۸۶۹ء	تعداد مکاتیب: عود ہندی	اردوئے معلی	جملہ	نشان سلسلہ
۱	میر غلام بابا																					۹	۱	۱۰	۱
۲	میاں داد خاں سیاح																					۲۰	۵	۲۵	۲
۳	حبیب اللہ خاں ذکا																					۱۱	۴	۱۵	۳
۴	ہرگوپال تفتہ																					۷۳	۴۹	۱۲۲	۴
۵	شہزادہ بشیر الدین																					۲	۳	۵	۵
۶	فقیر صاحب																					۴	۱	۵	۶
۷	میر مہدی مجروح																					۲۰	۲۶	۴۶	۷
۸	قاضی عبد الجمیل																					۳	۹	۱۲	۸
۹	غلام نجف خاں																					۸	۱۵	۲۳	۹
۱۰	میر ابراہیم علی خاں وفا																					۵	۰	۵	۱۰
۱۱	سید احمد حسین																					۱۰	۱	۱۱	۱۱
۱۲	منشی نبی بخش																					۲	۰	۲	۱۲
۱۳	خواجہ غلام غوث خاں																					۴	۱۰	۱۴	۱۳
۱۴	مرزا شہاب الدین خاں																					۳	۴	۷	۱۴
۱۵	میراں صاحب																					۲	۰	۲	۱۵
۱۶	شیو نرائن																					۲۹	۴	۳۳	۱۶
۱۷	امین الدین خاں لوہارو																					۴	۲	۶	۱۷
۱۸	مرزا علی علاء الدین خاں																					۲۸	۲۵	۵۳	۱۸
۱۹	پیارے لعل																					۲	۲	۴	۱۹
۲۰	سید غلام حسنین																					۶	۱۵	۲۱	۲۰
۲۱	چودھری عبد الغفور سرور																					۱	۱۶	۱۷	۲۱
۲۲	شاہ عالم																					۱	۱	۲	۲۲
۲۳	ظہیر الدین احمد خاں																					۱	۰	۱	۲۳
۲۴	احمد حسین																					۱	۱	۲	۲۴
۲۵	منشی عبد اللطیف																					۱	۰	۱	۲۵
۲۶	مرزا باقر علی خاں																					۲	۱	۳	۲۶
۲۷	حسین مرزا																					۲	۲	۴	۲۷

باب چہارم

مسائل غالب

سوانح حیات

کسی شاعر کا مطالعہ یا تو صرف اس کے کارناموں پر محدود ہو سکتا ہے یا اس مطالعہ میں اس کے سوانح حیات بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ چونکہ سوانح زندگی کا خاکہ شاعر کے محض کارناموں کے غور و فکر میں بھی ہر طرح مفید ثابت ہوگا اس لئے محقق کو غالب کی سرگزشت حیات کی نہ صرف تعمیر کرنی پڑے گی بلکہ اس کے ہر تفصیلی پہلو کو بلحاظ ضرورت اور تا بہ امکان، کلام شاعر سے مربوط و متعلق کر کے دکھانا پڑے گا۔

واضح رہے کہ کسی شاعر کے سوانح کی افتاد قدرتاً ایک ساست

داں یامدبر کی سوانح عمری سے مختلف ہوگی یہ معلوم کرنا یقیناً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شاعر کہاں پیدا ہوا اس کے والدین کون تھے۔ نوعمری، عنفوان اور شباب کو کس طرح بسر کیا اور زندگی کی ہر منزل میں اس کو کن واقعات سے دو چار ہونا پڑا۔ یوں تو اس قسم کے تفصیلی امور ہر شخص کی منضبط سوانح عمری کے لئے ضروری ہیں لیکن شاعر کے معاملہ میں ہمارا ذوق استفسار اس سے بھی آگے نکل جاتا ہے مثلاً اس کی زندگی کے ہر واقعہ میں کون سے مفہوم اور معانی پوشیدہ ہیں اور اس کا اثر شاعر کے ذہنی نمو اور ارتقاء پر کس طرح پڑا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حیات غالب کی ایک منضبط داستان کے مرتب کرنے میں کس قسم کا مواد ہماری دسترس میں ہے۔ اضافی ماخذوں میں اس وقت تک تو حالی کی یادگار غالب اور محمد حسین آزاد کے آب حیات والے سوانح خاکہ پر ہی نظر پڑتی ہے اس کے علاوہ بعض چھوٹے چھوٹے خاکے بھی ہیں جو دیوان غالب کے مختلف اڈیشنوں میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن ان سے ہمیں خاطر خواہ مدد نہیں مل سکتی کہ یہ زیادہ تر حالی اور آزاد ہی کے مواد پہ مبنی ہیں سب سے زیادہ اہمیت مطلق ماخذوں کو حاصل ہے لیکن یہ سب

باب چہارم

مسائلِ غالب

سوانحِ حیات

کسی شاعر کا مطالعہ یا تو صرف اس کے کارناموں پر محدود ہو سکتا ہے یا اس مطالعہ میں اس کے سوانحِ حیات بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ چونکہ سوانح زندگی کا خاکہ شاعر کے محض کارناموں کے غور و فکر میں بھی ہر طرح مفید ثابت ہوگا اس لئے محقق کو غالب کی سرگزشت حیات کی نہ صرف تعمیر کرنی پڑے گی بلکہ اس کے ہر تفصیلی پہلو کو بلحاظ ضرورت اور تا بہ امکان، کلامِ شاعر سے مربوط واقعاتی کر کے دکھانا پڑے گا۔

واضح رہے کہ کسی شاعر کے سوانح کی افتاد قدرتاً ایک ساست

کے سب ہمارا ہاتھ نہیں بٹا سکتے۔ ان ماخذوں میں خود غالب کے اردو اور فارسی مکاتیب، زندان والی مثنوی اور دستنبو ہیں۔ مؤخرالذکر ایک قسم کی آپ بیتی ہے جس میں ۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۸ء کے حالات پائے جاتے ہیں۔ لے دے کر یہی ماخذ ایک محقق کا آخری سہارا ہیں جن سے غالب کی زندگی کے تفصیلی واقعات معین کئے جا سکتے ہیں۔ ان میں اردو خطوط خاص طور پر ہماری مدد کر سکتے ہیں کیونکہ یہ نہ صرف ان واقعات پر حاوی ہیں جو ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک پیش آتے رہے بلکہ جگہ جگہ ان میں واقعات پیشین کی یاد بھی پائی جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ ماخذ خواہ وہ اضافی ہوں یا مطلق سوانح غالب کے متعلق پوری طرح ہماری پیاس کو نہیں بجھا سکتے پھر بھی ایک محقق ان سے کام ضرور لے سکتا ہے ان کی مدد سے وہ شاعر کی زندگی کا ایک سرسری خاکہ مرتب کر سکتا ہے اس میں جامعیت نہ سہی، نمایاں خد و خال تو صحت کے ساتھ معلوم ہو سکتے ہیں نیا مواد ہاتھ آتا ہے تو اس سرسری خاکہ میں اور بھی رنگ بھرے جا سکتے ہیں۔"

موجودہ مواد سے کام لیتے وقت محقق کو وہ احتیاط ملحوظ رکھنی چاہئے جس کا اشارہ ہم کسی اگلے باب میں کر آئے ہیں یعنی وہ ہر چیز کو

محض اعتماد کی بناء پر قبول نہ کرے خواہ اس کے راوی خود غالب ہوں یا مولانا حالی اور آزاد۔ اس تاکید سے حاشا یہ جتلانا مقصود نہیں ہے کہ وہ کھلم کھلا قارئین کی گمراہی کر رہے ہیں بلکہ اس کی غایت صرف یہ بتلا دینا ہے کہ ان بزرگوں نے واقعات کو صحت کے ساتھ بیان کرنے کی کافی زحمت برداشت نہیں کی مثلاً غالب کی زندگی کے ایک واقعہ کو لیجئے۔ غالب کا بیان ہے کہ اس نے پندرہ سال کی عمر یعنی تقریباً ۱۸۱۲ء سے اُردو میں غزل کہنی شروع کی اور ابتدائی چند سال (ایک یا دو برس) تک وہ اپنا تخلص اسد کرتا رہا[1]۔ لیکن اس کے اردو دیوان سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی اس کے لئے اِس حصہ کلام کو ملاحظہ کیجئے جو پختہ عمر (۱۸۴۳ء تا ۱۸۵۵ء) میں موزوں ہوا اس میں آپ کو کئی غزلیں ایسی ملیں گی جن میں اسد تخلص کیا گیا ہے[2]۔

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی | سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا | دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ | کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

---

[1] اردوئے معلی لاہور ۱۹۲۶ء صفحہ ۲۷۵ [2] ملاحظہ ہو تاریخ وار دیوان غالب۔

محمد حسین آزاد بھی اسی طرح بعض وقت صحت بیان کا خیال نہیں رکھتے آب حیات میں لکھتے ہیں کہ شاعر نے ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۸ء) میں اپنا تخلص غالب اختیار کیا اس کی بھی تصدیق اس کے اردو دیوان سے نہیں ہوتی اور نہ آزاد یہ بتلاتے ہیں کہ انتخاب تخلص کی یہ تاریخ وہ کس بنیاد پر قرار دیتے ہیں۔

جیسا کہ باب اوّل میں ظاہر کیا گیا ہے حالی بھی شاعر کی تفصیلات زندگی کے معین کرنے میں ہمارے لئے خضر راہ نہیں بن سکتے۔ ان کی حقیقی دلچسپی غالب کے واقعات زندگی سے وابستہ نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان واقعات کی ترتیب بہت ہی منتشر اور پراگندہ حالت میں پائی جاتی ہے۔ حالی کی اصل غایت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک شاعر اور دلفریب شخصیت کی حیثیت سے غالب کی عظمت کا سکہ قارئین کے دلوں پر بیٹھا دیا جائے۔ اس اثر آفرینی کے شوق میں وہ بھول کر متضاد بیانات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ملّا عبدالصمد کے کے معاملہ پر پھر ایک مرتبہ غور کیجئے اور ذیل کے دو بیانات کا موازنہ کیجئے۔

"مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبدالصمد ان کے مکان پر

وارد ہوا ہے۔"

اور کل دو برس اس نے وہاں قیام کیا۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اس کی صحبت میں گزری تو عبدالصمد اور اس کی تعلیم کا عدم و وجود برابر ہو جاتا ہے اس لئے مرزا کا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد ایک فرضی نام ہے۔"

" مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر ملا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب فارسی کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کی بول چال اور اون کی قوت متخیلہ پر چڑھ گیا تھا۔"

اب یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ایک محقق کو جو مستند سوانحی مواد کی تعیین و ترتیب کرنا چاہتا ہے کس قدر ہوشیار رہنا چاہیئے۔ اس کو حالی اور آزاد کے بیانات کی بھی مناسب قدر کرنی چاہیئے اور ان کا مقابلہ ان واقعات سے کرنا چاہیئے جن کو شاعر نے اپنی تصنیفات میں بیان کیا ہے پھر داد و تحسین کی کمزوریوں فطری فخر و مباہات اور شاعرانہ تعلّی کو نظر انداز کر کے اپنے طور پر رائے زنی کی جا سکتی ہے۔

شاعری

مطالعۂ کلامِ غالب کے کیا مسائل ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس سے خود بخود ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے مسائل ہیں جو عام طور پر شاعری سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس سے پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود شاعری کیا ہے اور اس کا کس طرح تعین کیا جا سکتا ہے۔

اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری رہبری کے لئے شاعری کی تعریف اور نظریوں کی کمی نہیں لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ دفتر کس قدر وسیع اور پریشان کن ہے۔ بعض لوگ قوتِ شعر ہی کو فنِ شعر سمجھ بیٹھے۔ بعض شاعری اور عام فن میں بمشکل امتیاز کر سکے۔ کسی نے شاعری کی ماہیت بیان کر دی اور کسی نے اس کی غرض و غایت پر اکتفا کیا۔ اس طرح کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ اب یہ بتلائیے کہ کس خاص صاحبِ نظریہ سے ہمیں اس سوال کا جواب مل سکتا ہے کہ غالب کی شاعری کے کون سے مسائل

ہماری غور و فکر کے محتاج ہیں۔ کیا وہ مسائل یہ ہو سکتے ہیں کہ غالب کی شاعری "خیال و احساس کے باطنی زمان و مکان کی توضیح و تعبیر ہے" (ہیگل)" کیا وہ کوئی سیر ملا خیال ہے" (کارلائل)" کیا وہ مثالیت کے مترادف ہے" (رولینڈ ہزارڈ)" کیا وہ ایسا عالمگیر علم ہے جس سے نہ تو کوئی وحشی قوم معرّا رہی۔ اور نہ کوئی صاحب فہم قوم گریزاں" (فلپ سڈنی)" کیا وہ جذبات کا ایک شعلہ اور خوشی کی کوئی لہر ہے" (شارپ)" وہ کوئی ربّانی چیز ہے؟ علم و حکمت کا مرکز بھی ہے اور محیط بھی؟ بہترین اور بہترین نشاط دماغوں کی بہترین اور بہترین نشاط گھڑیوں کا مرقع ہے؟ (شیلی) علم و فن سے بے نیاز، وہ علم کا نچوڑ اور جوہر لطیف یعنی بے ساختہ بول ہے۔ ہیجان کے ساتھ ساتھ وفور لذت کا سرچشمہ ہے؟ (ورڈس ورتھ)" تخیل کے لئے جذبات عالیہ کا مجسم نغمہ ہے" (رسکن)" خاص خدا ہی کی کوئی چیز ہے؟ (ہیلی) "یا صرف ایک منظوم عبارت ہے۔" (وہیٹلی) وغیرہ وغیرہ۔ ملحوظ خاطر رہے کہ اس سلسلہ کو ہم نے صرف عصر حاضر کے نقادوں تک محدود رکھا۔

محقق کو یہ محسوس ہو گیا ہو گا کہ ان تعریفات کا اکثر حصہ وہندلی قدر پیمائیاں ہیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ تعریفات اور نظریوں

کی ان بھول بھلیوں میں پڑنے کے بجائے وہ چند صاف سیدھے سوالات کرے اور ان کے اثر کا تماشا دیکھے۔

جب ہم کسی شاعر کی کسی نظم کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے؟ اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ نظم دراصل ایک آلہ ہے جس سے شاعر اپنے باطنی تجربہ کو اوروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے یہ گویا اس کی واردات قلب کا ایک آئینہ ہے جس میں اوروں کو بھی اپنے دل کی بات نظر آتی ہے اب نظر دوڑا کر یہ دیکھنا چاہیئے کہ شاعر اس کوشش میں کتنی منزلیں طے کرتا ہے۔ ہم نے ابھی ابھی یہ بیان کیا کہ نظم اصل میں ایک آلہ اظہار ہے سوال یہ ہے کہ اس کے مختلف اجزا کیا ہیں؟ سب سے پہلے الفاظ ہیں جن کو ہم "لفظیات شعر" کے نام سے یاد کرتے ہیں پھر وہ خاص طریقہ ہے جس کی مدد سے ان الفاظ کو صنعت گری کے ساتھ کچھ اس طرح جوڑ دیا جاتا ہے کہ ان میں تکمیل اور وحدت یا ہم آہنگی کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ یہ طریقہ اصطلاح میں "تنظیم شعر" کہلاتا ہے اس ساری کاوش کا نتیجہ "صورت شعر" ہے جس کا منشا سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ شاعر کے دل کی بات یعنی اس کے "شاعرانہ تجربہ" کی ترجمانی کرے یہ شاعرانہ تجربہ کس طرح ظہور میں آتا ہے؟

شاعر کے دل میں ایک بات اتر جاتی ہے جو یا تو خود اس کی اپنی یا اوروں کی زندگی کے کسی واقعہ پر مبنی ہوتی ہے یا کسی خیال، کنایہ یا یاد پر۔ یہی شاعر کا "مواد" کہلاتا ہے۔ یہ مواد شاعر کے دل میں جاگزیں ہو کر اس کے تخیل کے زیر اثر کیفیات، احساسات اور تعبیرات کو اکساتا اور خود ان میں گم ہو جاتا ہے بہ الفاظ دیگر وہ شاعر کی روح میں سما کر کچھ اس طرح شیر و شکر ہو جاتا ہے کہ اسی کا ایک مستقل اور لاینفک جزو بن جاتا ہے اس کو ادبی تنقید کی زبان میں "القا" کہتے ہیں۔ یہ القا ہر شخص پر طاری ہو سکتا ہے لیکن جب تک کہ وہ خاص روپ یا بہ زبان اصطلاح ایک مستقل شکل میں "تصویر پذیر" نہ ہوے باطنی عمل مکمل نہیں ہو سکتا یہ عمل اگر مکمل ہو بھی جائے تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ شاعری وجود میں آ گئی۔

صرف "تصور" شاعری نہیں۔ ہم میں کے سب نہیں تو بعض ضرور ایسے ہیں جن کے دلوں میں ہر روز کوئی نہ کوئی بات اتر کر القا کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور بعض اوقات یہ القا ر ایک موزون اور مستقل صورت بھی اختیار کر لیتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسی کا نام شاعری ہے اور کیا ہم سچ مچ شاعر ہو گئے؟ ہم بیشک اس مرتبہ پر فائز ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم اپنے "تصور" کو اس کے تمام خد و خال کے ساتھ اوروں

تک پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں لیکن یہ ہمارے بس کی چیز نہیں ایک سچا شاعر زبان کے سہارے اس کو کر دکھاتا ہے مکمل نظم دراصل باطنی تصور کی آئینہ بردار ہے وہ صورتاً اپنی اصل سے جس قدر قریب ہو گی اسی قدر اس کا پایہ بہ حیثیت فن بلند ہو گا اور شاعر کا مرتبہ بھی ایک صاحب فن کے اعتبار سے اعلیٰ وارفع ہو گا۔

مذکورۂ بالا گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نظم کی ابتدا شاعرانہ اضطراب سے ہوتی ہے جس کو ہم "ابتدائی ہیجان" سے تعبیر کر سکتے ہیں یہ ہیجان جو کسی نہ کسی وجہ پیدا ہو جاتا ہے شاعر کے دل پہ اثر انداز ہوتا اور اس کی روح میں بس جاتا ہے۔ پھر اس پہ بعض کیفیات و خیالات کو طاری کر کے ایسی "مخصوص" شان "حاصل کر لیتا ہے جو جلد یا بتدریج ایک صورت اختیار کرتا اور بالآخر زبان کے ذریعہ لباس نظم میں دنیا کے سامنے پیش ہوتا ہے۔

اس عمل کی مختلف ارتقائی منزلیں ہمارے پیش نظر رہنی چاہئیں تاکہ اس امر کا تعین ہو سکے کہ غالب کی شاعری سے کون سے سوالات درحقیقت متعلق ہیں۔

لیکن اس پہ عمل پیرا ہونے سے پہلے محقق کو غزل گوئی کی

چند خصوصیات پہ غور کرنا پڑیگا۔

سب سے اوّل تو یہ کہ غزل کی حیثیت نظم کی نہیں اس میں نہ تو وحدت پائی جاتی ہے اور نہ اس کے باہمی اجزا ء میں کوئی ہم آہنگی اس لئے اس کی کوئی عضوی صورت بھی نہیں غزل الگ الگ اشعار کا گچھا ہے اس میں کبھی کبھی ایک خاص مفہوم ایک سے زائد اشعار میں جھلکنے لگتا ہے۔ لیکن عموماً ہر شعر اپنا مستقل وجود رکھتا ہے ایک شعر کا دوسرے شعر سے اگر کوئی تعلق ہوتا بھی ہے تو اس کی بنیاد صرف وہ آواز ہے جو ردیف یا قافیہ سے پیدا ہوتی ہے اور جس کی اہمیت سوائے ترنّم کے اور کچھ نہیں۔

اس طرح ایک غزل گو شاعر کا دائرہ عمل بہت ہی تنگ اور محدود ہوتا ہے یعنی صرف ایک شعر۔ ایک اچانک خیال یا الفاظ کی ماہرانہ ترکیبیں اس کے فن یعنی فن غزل گوئی کی تمام پیچیدگیوں کی حامل ہو سکتی ہیں۔ مثنوی۔ قصیدہ۔ مسدس۔ ترجیع بند کا البتہ یہ حال نہیں ان کا دائرہ عمل نسبتاً وسیع ہوتا ہے اور جذبہ و تخیل میں ربط و تسلسل پایا جاتا ہے نیز شاعر کو ان اصناف میں زیادہ کمال صرف کرنا پڑتا ہے شاید اسی بناء پہ غالب نے ایک مرتبہ محسوس کیا کہ اس کا بہترین کمال اس کے

قصائد میں ہے۔ اس کمال سے غالباً اس کا منشاء اس کا اپنا "فنی" کمال ہے کیونکہ اس کی بہترین "شاعری" مسلمہ طور پہ اس کی غزلوں ہی میں پائی جاتی ہے۔

غزل گوئی کی دوسری خصوصیت جو ہر اچھوتے سے اچھوتے احساس کا گلہ گھونٹ دیتی ہے وہ ان چند خاص مقررہ اوزان، صنائع بدائع، اور تشبیہ و استعارہ کی تقویم پارینہ کی روایتی پابندی ہے۔ جو فارسی اور اس کی راہ سے عربی سے مستعار لئے گئے ہیں موجودہ زمانہ میں رسم و قدامت کی زنجیریں آسانی سے توڑی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس زمانہ میں خود غالب کے لئے جو حتی الامکان رسم پرستی کے خلاف جنگ آزما ہوتا تھا، یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔

یہی وجہ ہے کہ غالب میں ایک طرف تو رسم قدیم کی پابندی نظر آتی ہے اور دوسری طرف اس لکیر سے ہٹ کر خود اپنا ایک الگ راستہ بنانے کی محسوس مگر دبی ہوئی کوشش اس آخری پہلو سے اگر اس کے کارناموں پہ نظر ڈالی جائے تو واضح ہوگا کہ وہ مقررہ اوزان و بحور کی کوتاہیوں سے اپنا سر نہیں اٹھا سکا البتہ گا ہے ماہے مقررہ "لفظیات"

سے بلند نکل گیا۔

یہ معلوم کرنا مشکل نہیں کہ غالب کے کن اشعار میں یہ اثارنگ نمایاں ہے لیکن چونکہ رسمی الفاظ بھی بعض اوقات ایک اصلی احساس کو جامہ پہنا سکتے ہیں اس لئے رسمی اشعار کا تعین کرنا محض ایک قیاس پہ مبنی ہوگا۔ اسی طرح باقی تمام اشعار کو شاعر کے اصلی شاعرانہ تجربہ کا مظہر قرار دینا بھی ایک قیاسی چیز سمجھی جائیگی تاہم بعض اشعار کے متعلق یہ بتلانا زیادہ مشکل نہیں ہے کہ وہ اپنی خصوصیت پنہاں یا شاعر کے بعض واقعاتِ زندگی کے لحاظ سے اپنے اندر اصلیت کی شان رکھتے ہیں۔

انگلستان کے مشہور نقاد اور شاعر مسٹر لیا سلس کر لمبے اپنے دلپذیر اور فکر انگیز رسالہ نظریۂ شاعری میں یہ بیان کرتے ہیں کہ "کسی شاعر کا اقرار انسان کی زندگی کے ان اسرار سے وابستہ نہیں ہوتا ہے جن کو واضح کرنے کی ناکام کوشش اس کی سوانح عمری میں کی جاتی ہے۔" یہ خیال رزمیہ یا تمثیلی شاعری پر غالباً صادق آسکتا ہے بلکہ شاید "تخلیقی سرودی شاعری" یا "خیالی سرودی شاعری" پر بھی پورا اترے[1]۔ لیکن یہ کسی طرح

---

[1] لندن مارٹن سیکر ۱۹۲۲ء۔ [2] باب ششم بھی ملاحظہ ہو ۱۲ر

بھی خالص اور وجدانی شاعری پہ پورے طور پہ چسپاں نہیں ہوتا۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ "رگبی چیپل" میں عالمی اثر کے علاوہ پس پردہ سوانحی رنگ بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔ ملٹن کا سانٹ اپنی "نابینائی"، پر کبھی اس درجہ کا دلگداز اور جذبہ بھیلا سا نہٹ نہیں ہوتا اگر اس میں عالمی عنصر کو اپنی ذاتی مصیبت میں جذب کر کے تمثالی قالب میں پیش نہ کیا جاتا۔ یہی بات "لسی ڈاس۔" "تھرسس" "ان میموریم"، "یولی سس"، اور اسی قسم کی نظموں میں پائی جاتی ہے۔ اگر شاعرانہ پیداوار، شاعر کی زندگی سے مربوط کر کے نہ دکھائی جائے تو غالب کے ان اشعار کے تعین کرنے کا ایک قوی آلہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا، جو اس کے ذاتی جذبات کے مظہر ہیں۔ اس امر سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ذیل اشعار جو عارف کی وفات پہ لکھے گئے تھے باوجود اپنے عالمگیر اثر اور دائرہ عمل کے اپنے اندر کوئی سوانحی اہمیت نہیں رکھتے۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور ۔۔۔ تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائیگا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا ۔۔۔ ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

نادان ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

یہی وہ شخصی نوعیت ہے جو اس مرثیہ کے عالمگیر اثر میں جادو پیدا کر رہی ہے ۔

اب ہم پھر غالب کی شاعری کی طرف لوٹ کر یہ دیکھیں گے کون سے سوالات اس کے مباحث سے متعلق ہیں ۔

۱۔ ابتدائی ہیجان ۔

وہ کون سی دنیا تھی جس سے غالب کو اپنی شاعری کیلئے موضوع ہاتھ آئے ۔ ان میں بعض موضوع تو رسم پرستی کے حلقہ سے متعلق ہوں گے ۔ اور بعض خود اس کی اپنی ذات سے ۔ کیا محقق ان دونوں میں امتیاز اور ان کا تجزیہ کر سکتا ہے ؟ ہر

صورت میں ابتدائی ہیجان اور محرکات کیا تھے؟

۲۔ القار ۔

اس کے موضوعات نے خود اس کے ذہن پر کیا ردِّعمل کیا اور کیا یہ ردِّعمل اس کے ذہن کی کسی ہم آہنگ مرکزی مصروفیت سے متعلق کیا جا سکتا ہے؟ یہ الفاظ دیگر یہ مختلف موضوع اس کے ذہن میں بالآخر کیا شان اختیار کرتے ہیں اور کیا یہ شان خود شاعر کے دماغی اور جذباتی رجحان حیات سے متاثر ہوئی؟

۳۔ تصور ۔

ہر شان بالآخر کس شکل، صورت یا تصور میں شاعر کے ذہن پر اس کے رجحان حیات کے زیر اثر متمکن ہوئی۔

۴۔ لفظیات شعر ۔

کون سی زبان یا "لفظیات شعر" شاعر نے اپنے تصور کی ترجمانی کے لئے منتخب کی؟ کس حد تک اس نے قدیم ذخیرے سے کام لیا اور کس حد تک اس سے اجتناب کیا؟

۵۔ تنظیم شعر اور صورت شعر ۔

لفظیات شعر میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور اس کو صورت بخشنے

کے کیا وسائل اس نے اختیار کئے؟ اس سلسلہ میں اس کی منہت پذیری کا پتہ لگایا جا سکتا ہے؟ خاص خاص ردیفیں اور خاص خاص صورتیں شاعری کے مختلف دوروں میں اس کو زیادہ مرغوب رہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ بعض ردیفوں کو اس نے ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک ہی غزل یا ایک ہی صورت اظہار میں اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ شعر پہلو بہ پہلو پائے جاتے ہیں۔

اب یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ غالب جیسے غزل گو شاعر کی منزلت معلوم کرنے کے لئے ہمیں نہ صرف فرداً فرداً ہر شعر کے شعری عمل پر غور کرنا چاہیئے بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ کسی شعری پیداوار میں مجموعی حیثیت سے تمام اشعار کا کیا درجہ ہے؟ وجدانی شاعری کے مجموعی غور و فکر کے پھر یہ معنی ہوئے کہ شاعر کی حیاتی زاویہ نگاہ کی بنیاد پہ تعمیر کی جائے ان حالات میں صحیح رائے زنی اسی وقت ممکن ہے کہ پہلے اس زاویہ نگاہ کو مشخص کر لیا جائے۔

باب پنجم

غالب کا زاویہ نگاہ زندگی کے متعلق

انسان کا زاویہ نگاہ کوئی معین چیز نہیں۔ اکثر و بیشتر یہ تدریجی ارتقار کا نتیجہ ہوتا ہے۔ زندگی کے ساتھ ساتھ یہ بھی اپنا رنگ اور روپ بدلتا رہتا ہے اسی لئے ہم اس کو جامد اور ساکن چیز نہیں بلکہ حرکت و بیتابی کا سیلاب سمجھتے ہیں جو انسانی گوشت پوست کی طرح بڑھتا رہتا ہے، بچپن، لڑکپن سے اور لڑکپن شباب سے بدل جاتا ہے جس کے ساتھ پختگی اور بزرگی کے رنگ چڑھنے لگتے ہیں اسی طرح انسان کا زاویہ نگاہ زندگی کا ایک خاص انداز ہے جس کو ذہن انسانی اندرونی و بیرونی قوتوں کے زیر اثر رفتہ رفتہ حاصل کرتا ہے اس لئے اس مسئلہ کی تحقیق تاریخی نقطہ سے کرنی ضروری ہے

بہ الفاظ دیگر ایک محقق کا یہ فرض ہے کہ غالب کے نادیۂ نگاہ پر دور رس غور و فکر کرنے سے پہلے ان تمام قوتوں کی تاریخ اور خصوصیت سے واقف ہو جائے جو دوران حیات میں اس کے ذہن پر کارفرما رہی ہے۔

خارجی اثرات

سب سے پہلے ان اثرات کی چھان بین کر لی چاہیئے جو اس (غالب) کے گھر کی ابتدائی گھر کی تعلیم و تربیت سے مرتب ہوئے، اگر اس کے والد اور اکلوتے چچا کا انتقال پانچ برس کی عمر سے پہلے ہی ہو چکا تھا جیسا کہ خود غالب کہتا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے اس کی پرورش کی؟ وہ کس قسم کے لوگ تھے اور کس ڈھب سے انہوں نے اس کے دل و دماغ پر نقش بٹھائے؟ تعلیم کس قسم کی دی گئی اور اس کے تعلیم دینے والے کون تھے؟ عبدالصمد اور شیخ معظم اس کے استاد بیان کیے جاتے ہیں۔ ان کی بزم تعلیم سے اس کو کیا

۱؎ اردوئے معلیٰ لاہور ۱۹۲۲ء صفحہ (۱۰۵)

فیض حاصل ہوا۔ اس کے اور بھی کوئی استاد تھے جن کے فیض و اثر کا پتہ چلایا جا سکتا ہے؟ کون سے مضامین اور کتابیں اس کو سب سے زیادہ مرغوب تھیں بعض حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی غزل گوئی پر نظیری، عرفی، ظہوری، شیخ علی حزیں، اور طالب آملی کے بھی اثرات پڑے ہیں۔ ان کا اثر ممکن ہے کہ اس کی تنظیم شعر پر پڑا ہو لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے خیالات پر اس کے اثرات کس طرح مترتب ہوئے۔

دوسرا جز جو انسان کی ذہنی نشو و نما پر کارفرما رہتا ہے وہ اس کا سماجی ماحول ہے جس میں وہ (ذہن) پلتا ہے۔ غالب آگرہ میں پیدا ہوا لیکن اس کی نوعمری کا بڑا حصہ دہلی میں بسر ہوا جہاں اس نے مستقل اقامت اختیار کر لی، یہاں اس کو بہادر شاہ کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی، یہ دربار اس معاشرتی تنظیم کا مظہر تھا، جس کا شیرازہ سارے شمالی ہند میں بکھر رہا تھا۔ غالب نے اگرچہ دہلی کو اپنا گھر بنا لیا تھا لیکن زمانہ کی گردش اس کو کلکتہ لکھنؤ، رام پور، بنارس اور دیگر مقامات پر لئے لئے پھری جہاں اس کو بھانت بھانت کی چیزوں اور بہت سے نئے انسانوں سے سابقہ پڑا۔ کیا محقق ان نقوش کو اجاگر کر سکتا

ہے جو مختلف مقامات پر اس کے دل و دماغ پر مرتسم ہوئے؟

اس کے بعد ان واقعات کی جستجو کرنی چاہئے جو بلحاظ نوعیت اُس کے عام زاویہ نگاہ میں خلل انداز ہوئے، انسان کو ہمیشہ چین کی زندگی نصیب نہیں ہوتی ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں جو اس کی دماغ کی رو کو بدل دیتے ہیں چنانچہ قمار بازی کے جرم میں سزائے قید کا بھگتنا غالب کی زندگی میں اسی قسم کا ایک واقعہ ہے۔ دوسرا واقعہ ۱۸۵۷ء کا قیامت خیز غدر ہے۔ اسلامی طبقہ پر یہ ایک مصیبت تھی جس کی زد میں بہت سے مسلمان آگئے اور غالب بھی اس زد سے نہ بچ سکا اس کی مالی حالت خاص طور پر اس واقعہ سے متاثر ہوئی۔ ان دو واقعات میں قید ہی کو سب سے زیادہ اہمیت دینی چاہئے اور اس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں کہ خود غالب کو اس کا بڑا صدمہ ہوا جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"میری یہ آرزو ہے کہ میں دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے یہ بھی جانے دو کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمۃ اللعلمین

دل دادوں کی تکیہ گاہ۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی
قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے نجات پاؤں
اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل قرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں۔

یہ واقعہ اس کی وفات سے کوئی بیس سال پہلے کا ہے اس لئے محقق کو پایان عمر کے کلام میں ان واقعات کو ڈھونڈھ نکالنا چاہیے جو کسی ردعمل کا پتہ دیتے ہوں۔ قید کے زمانہ میں غالب نے فارسی میں ایک ترکیب بند لکھا تھا۔ جس سے مردم بیزاری کی بو آتی ہے۔

انچہ فرداست ہم امروز در آمد گوئی   آفتاب از جہت قبلہ برآمد گوئی
دل دوستے کہ مرا بود فرماند زکار   شب و روزے کہ مرا بود سرآمد گوئی

بہرۂ اہل جہاں چون زجہاں درد و غم است
بہرۂ من زجہاں بیشتر آمد گوئی

رازدانا غم رسوائی جاوید بلاست   بہر آزار غم از قید فرنگم نہ بود
جور اعدا روداز دل بہ ہائی لیکن   طعن احباب کم از زخم خدنگم نہ بود

۱؎ یادگار غالب سنہ ۱۹۲۴ء صفحہ ۲۷۔

کیا یہ بات اس کی غیر معمولی معصیت سے یکایک ظہور میں آگئی یا جو چیز پہلے ہی سے اس میں موجود تھی اسی کے اظہار کی یہ ایک شدید صورت تھی۔ اگر یہ زندان کی بے ساختہ پیداوار تھی تو اس کے بعد زندگی میں کوئی ایسے واقعات بھی پیش آئے، جنھوں نے اس رجحان کو دھیما کر دیا۔ یا وہ اسی کے ساتھ پیوند خاک ہو گیا۔ اور مرتے دم تک وہ اپنی ہر سرگزشت حیات کو اسی کی یاد میں محو کرتا رہا۔

شخصی رجحانات

اس کی زندگی کے ان خارجی واقعات کے علاوہ جن سے اس کے افکار و خیالات متاثر ہوئے۔ ہمیں یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ کون سے رجحانات تھے جو خود اس کے خون میں موجود تھے یا جن کی اس نے پرورش کی۔

غالب اپنے آبا و اجداد کو، جہاں تک اس کا حافظہ کام دیتا

ہے سپاہی پیشہ بتلاتا ہے۔ بعض دوسروں کی خانہ جنگی میں کام آئے جن میں اس کے والد بھی شامل ہیں اور وہ اپنے اس "پیشۂ آبا" پر نازاں بھی ہے۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اگر اجیرہ داری اس کے خاندان کی خصوصیت تھی تو کیا اس رجحان کا ظہور کسی نہ کسی ڈھب سے ہمارے شاعر میں بھی ہوا کیا اور ایسے رجحانات کا بھی پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ جن کا اثر اس کی عادات و کیفیات اور اخلاق پر پڑا ہو۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس کی طبعی خصوصیات کی توضیح، نیز اس کو ذاتی کمزوریوں سے الگ کر کے سمجھنے میں دشواری لاحق ہو گی۔ اگر کوئی محقق، زندگی اور حسن کاری میں نظریہ توریث کا قائل نہیں ہے تو اسے غالب کی تمام گتھیاں سلجھانی پڑیں گی اور یہ بتلانا پڑے گا کہ بعض ایسے رجحانات کی آخر کیسی پرورش ہوئی جن کی جھلک اس کی تحریرات میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

بے اطمینانی کی لے

غالب کی زندگی شروع سے آخر تک بے اطمینانی سے لبریز ہے یہ چیز شاعری میں سب سے زیادہ بلند آہنگ معلوم ہوتی ہے۔ بے اطمینانی کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس میں شان ربوبیت پائی جاتی ہے جس سے آدمی میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ عالم جس میں وہ رہتا بستا ہے ایسا نہیں ہے جیسا کہ اس کو ہونا چاہیے پھر دل میں ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ کاش بساط زندگی پہ پاکیزہ اور ارفع خیالات کی ایک چادر چھا جائے جو ابن آدم میں مشیت الٰہی کی تبلیغ کرے۔ اس کی ایک اور صورت ہے جس میں انسان اپنے ماحول یا افتادِ زندگی سے بے اطمینان ہو جاتا ہے۔ یہ بے اطمینانی کسی حقیقی یا خیالی نقصان یا ناقدری کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ اور انسان کو مردم بیزار یا متنفر بنا دیتی ہے۔ اسی قسم کی بے اطمینانی غالب کی روح میں سما گئی تھی اس نتیجہ پہ پہنچنے میں محقق کو کسی قسم کی دقت نہیں پیش

آئے گا، کیونکہ شاعر کی جبین حیات پہ جھلکتی اور اوس کی تجربات میں شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔ اب محقق کا کام یہ ہے کہ اس بے اطمینانی کے سرچشمہ کی تلاش کرے۔

غالب کو ہمیشہ دو چیزوں کی شکایت رہی ایک تو اس کی ادبی کوششوں کی ناقدری اور دوسرے اس کی مالی مشکلات ان دونوں شکایتوں کی تحقیق احتیاط کے ساتھ کرلی ضروری ہے جیساکہ معلوم ہے غالب نے اوائل عمر ہی میں آگرہ سے ہجرت کی اور دہلی میں آبسا۔ دھلی نے اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ دربار شاہی نے خیر مقدم کیا اور اپنے بس کے تمام الطاف واکرام سے اس کو نوازا، نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ کے خطابات عطا کئے جو شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے شخص کے لئے معراج سمجھے جاتے تھے۔ منصب بھی عطا ہوا۔ جو اگرچہ زیادہ معقول نہ تھا لیکن حاکم وقت کی بیچارگی کے لحاظ سے خاصہ تھا یہ منصب اور خطابات کسی آبائی سپاہیانہ پیشہ کے صلہ میں نہیں بلکہ اس کی ادبی فتوحات کے صلہ میں عطا کئے گئے تھے۔ یہ اس کے جوہر ذاتی کی کافی قدردانی تھی۔ ایسی ہی قدر و منزلت لکھنؤ اور رامپور میں بھی ہوئی۔ اس کے علاوہ اہل علم قدردانان سخن کی

بھی کمی نہ تھی۔ جو اس کے کلام کو بنظر تحسین دیکھا کرتے۔ فضل حق اور نبی بخش جیسے نقاد، جن کی رائے کی خود غالب کے دل میں وقعت تھی اس کے شاعرانہ کمالات کے معترف تھے اور حق تو یہ ہے کہ یہی لوگ اس کو شاعری کی اعلیٰ تر مہموں کے لئے ابھارا کرتے تھے نیز ایسے احباب اور قدرشناسوں کا روزافزوں حلقہ بھی تھا جو راہ سخن میں اس کو اپنا رہبر اور "مضمون سمجھانے والا" سمجھتے تھے چاہنے والوں کے اس حلقہ میں حالی، نیرّ، رخشاں، سالک، مجروح، تفتہ، شیفتہ اور وحشت جیسے افراد نظر آتے ہیں۔

پھر بھی غالب کو اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ اس کو یہ معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ وہ ایک مخصوص طبقہ کا شاعر تھا۔ اور اپنے ہم عصر ذوق کی عام مقبولیت اس کے حصہ میں نہیں آسکتی تھی۔ اس کی لفظیات اور اسلوب اس قدر غریب تھے کہ عام لوگ اس کے پرجوش اور بعض اوقات نرالے تخیل کی روشوں میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ ایسی حالت میں چاہیئے تو یہ تھا کہ خود اس کا احساس کمال ہی اس کی تسکین کا سامان بنتا۔

تا زدیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن　　این مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است　　شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

اکثر اوقات شاعر، اپنی اعلیٰ تمناؤں کو بھول بیٹھا۔

مالی معاملات میں بھی اس کا یہی انداز تھا۔ حالی کی مستقل شہادت موجود ہے کہ غالب اس حیثیت سے ناموافق حالات میں کبھی گرفتار نہیں ہوا دوستوں اور مربیوں کی مالی اعانت کی بھی کوئی انتہا نہ تھی لیکن اس کے دل میں قناعت کی لہر تک پیدا نہیں ہوئی۔ اس کا ئی شاعر برنس کی طرح اس کا خیال تھا کہ وہ ایک لطیفہ غیبی ہے اور دنیا والوں کا یہ فرض ہے کہ اس کو احتیاجات سے بالاتر کر دیں اور ہر قسم کی عزت اور توقیر اس کے قدموں پر نثار کریں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ دنیا نے اس کو نہ صرف احتیاج سے بالاتر رکھا بلکہ سر آنکھوں پہ جگہ دی کسی ہم عصر صاحب علم وفضل کی اس سے بڑھ کر قدر و منزلت نہیں ہوئی۔ لیکن غالب کے ذہن کی ساخت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ نہ تو عطائے رحمانی کا شکر گزار تھا اور نہ کسی انسانی خدمات کا۔ خلاف مردانگی وہ ہمیشہ کڑھتا ہی رہا۔

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں　　آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

مزے جہاں کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اسکی خزاں نہ پوچھ

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہر خفت آسیا بگردش و ما در میان او
غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ میرود

جوہر طبع من درخشان ست و لیک
روز من اندر ابر پنہان میرود

تو میرسی ماگردش ایام ندارد
روزیکہ سیہ شد سحر و شام ندارد

یہ جستہ جستہ اشعار ہیں جن میں شخصی عنصر شاید زیادہ نہ ہو لیکن

اس کی فارسی مثنوی ابرِ گہربار کو لیجئے جو اسکی وفات کے چہلم سال قبل لکھی گئی تھی، یہ ایک طویل مناجات ہے جس میں رحمت الٰہی کو جوش دلایا گیا ہے کہ وہ اس کی بشری کمزوری کو بخش دے اس مقام پہ امید تھی کہ غالب کا سرِ نیاز جھک جائے گا کہ اس نے کفرانِ نعمت کیا اور اپنی ان خدا داد شاعرانہ قوتوں کو خام مقصد کی تلاش میں ٹھکرا دیا جن سے وہ آشفتہ حال ایران مصیبت کو مسرت و راحت کے لازوال نغمے سنا سکتا تھا۔ لیکن غالب ایسا کیوں کرنے چلا تھا۔ وہ پھر کہ الٹے خدا ہی کو مورد الزام قرار دیتا ہے کہ اس نے ظرف و حوصلہ سے زیادہ غم اس کے حصہ میں دیدیا۔ یہاں تک کہ وہ عطیات ربانی کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔

مرا نیز یارائے گفتار دہ ــــ چہ گویم بہ آں گفتہ زنہار دہ
دریں خستگی پوزشس از من مجوئے ــــ بود بندۂ خستہ گستاخ گوئے
من اندوہگین و مے اندوہ ربائے ــــ چہ می کردم اے بندہ پرور خدائے
حساب مئے و رامش و رنگ و بوئے ــــ ز جمشید و بہرام و پرویز جوئے
نہ از من کہ از تابِ مے گاہ گاہ ــــ بہ دریوزہ رخ برده باشم سیاہ
چہ پرسش رگے را بکار دل ــــ چو صد دجلہ خونم تماوہ زدل

بہر جرم کز روئے دفتر رسد ز من حسرتے در برابر رسد
بفرمائے کیں داوری چوں بود کہ از جرم من حسرت افزوں بود
ہر آئینہ ہم چوں منے را بہ بند تلافی فراخور بود نے گزند
بگیتی درم بے نوا داشتی دل من اسیر ہوا داشتی
نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد بہر بار زر پیل یا رم دہد
کہ چوں پیل زآں جا بر انگیزمے
زرش بر گدایاں فرو ریزمے

جب انسان کی غم گینی یہ صورت اختیار کر لیتی ہے کہ وہ خدا سے برسر پیکار ہو جاتا ہے تو اس کی حالت قابل رحم ہو جاتی ہے محقق کو اس کیفیت کے ارتقار کا پتہ بڑی احتیاط کے ساتھ لگانا چاہیئے۔ اور اس بات کو واضح کرنا چاہیئے کہ ایک شخص جو عقل و فہم سے اس قدر مالا مال تھا کس طرح اس بلا کی تلخی و الم کا شکار ہو گیا حالی اس کی یوں توجیہ کرتے ہیں کہ غالب نے بیزاری اور بے اطمینانی کا یہ میدان اپنے جوہر شعر کو چمکانے کے لئے پسند کیا تھا جس طرح اور شعرار نے عشق و مدح سرائی کے میدان اپنے لئے منتخب کر لئے یہ عذر اس قدر عجیب ہے کہ غالب کے محقق کو اس

سے مرعوب نہیں ہونا چاہئے یہ کوئی ادبی تنقید نہیں بلکہ بے محل خوش اخلاقی ہے۔ بھلا کون شخص محض شوق و تفنن میں دن رات آہ وزاری کر سکتا ہے۔ یہ بات تو دوبدو خود غالب ہی سے پوچھنی چاہئے۔ پھر ہمیں یہ ماننا پڑیگا کہ نظم و نثر میں جو وہ بار بار اپنی غمگینی کا اظہار کرتا ہے وہ صحیح ہے۔

مذہب

غالب کا ایک رجحان اور بھی توجہ کا محتاج ہے۔ ذکور و اناث کی کثیر تعداد کے حق میں مذہب ایک مقدس چیز ہے اور وہ اس سے کھیلا نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ دنیاوی اغراض کے لئے بھی اس کو ہاتھ لگانا پسند نہیں کرتے لیکن غالب نے ہمیشہ اس کے ساتھ آنکھ مچولی کی۔ مثنوی کے اس مشہور حصہ کو دیکھئے جس میں بہادر شاہ کو شیعی رجحانات سے مبرا دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، حالی

صاحب فرماتے ہیں "جب یہ مثنوی لکھنؤ بھیجی تو مجتہد العصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت ایسا اور ایسا لکھا ہے مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازم سرکار ہوں جو کچھ بادشاہ حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائیے۔"

پھر اس بات پر بھی غور کیجئے کہ وہابی فرقہ کے عقیدہ کے خلاف فارسی میں ایک مثنوی لکھ کر اس نے اپنے دوست مولانا فضل حق کا دل کس طرح خوش کیا حالانکہ اس کا ذاتی رجحان بالکل اس کے خلاف تھا اس سلسلہ میں وہ رباعی بھی ملاحظہ کیجئے جس میں بہادر شاہ سے خطاب کیا گیا ہے۔

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری   کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی   شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری

پھر لطف دیکھئے کہ اپنے ایک خط میں جو اس کے شیعہ دوست سید غلام حسین بلگرامی کو لکھا گیا تھا۔ خود کو "غالب اثنا عشری حیدری" بتاتا ہے۔ آخر ان کھیلوں سے فائدہ؟ زندگی کے ایسے اہم اور

مقدس معاملہ میں غالب بقول حالی اس قدر "مبلح محل" کیوں تھا ؟

وطن پرستی

ایک اور چیز ہے جس کی تنقیح غالب کے محقق کے لئے ضروری ہے ۔ یہ اصحاب اقتدار کو خوش رکھنے کا میلان ہے ۔ جب تک کہ بہادر شاہ قلعۂ دہلی میں متمکن رہے اور غالب کو قلیل آمدنی سے منصب عطا کرتے رہے شاعر نے مدح و ستائش کے خوب پھول برسائے لیکن جب اسلامی ہندوستان پہ بلائے عظیم نازل ہوئی اور بے کس و نامراد بادشاہ اپنی جنم بھومی سے نکال دیا گیا جہاں اس کے شوکت مآب آباء و اجداد نے صدیوں تک جہاں بانی کی تھی تو غالب نے کیا کیا دہلی کے بہٹالوی ایجنٹوں نے اس شبہ پہ کہ وہ بھی دربار سے سازباز رکھتا ہے اس کا وظیفہ بند کر دیا غالب نے اس الزام سے برأت اور پنشن کو واپس حاصل کرنے کی عجیب دیوانہ وار

بے سو کوششیں کیں۔ اس نے گورنر جنرل کی خدمت میں ایک
قصیدہ گزرانا۔ جس میں نئے دور کے خوب ترانے گائے لیکن
بیچارے کو بڑا روکھا جواب ملا کہ برطانیہ اب اس قسم کی ضیافت طبع کی

لہ غالب کے زاویہ نگاہ پر یہ باب ابتداءً کوئی ڈیڑھ سال قبل عثمانیہ میگزین جلد (۱) نمبر ۲ میں شائع ہوا تھا جو بعد میں مسلم کرانیکل کلکتہ کے سالنامہ سنہ ۱۹۲۷ء میں شائع کیا گیا اس عرصہ میں غالب کی وطن پرستی کے متعلق جو خیالات میں نے ظاہر کئے تھے ان پر بعض لوگوں نے غور کرنا شروع کیا اور جو حضرات پہلے ہی سے اس خصوص میں کوئی خاص رائے رکھتے تھے وہ اس کے اظہار پر مائل ہوئے چنانچہ رسالہ اردو اورنگ آباد کے فاضل مدیر نے اردو جلد ۸ نمبر (۳) بابتہ جولائی سنہ ۱۹۲۸ء میں غالب کی ایک تحریر شائع کی ہے جس سے میرے اس خیال کی جو ایک سال قبل ظاہر کیا گیا تھا تائید ہوتی ہے اس تحریر کا علم جیسا کہ فاضل مدیر کا بیان ہے انہیں کئی سال قبل ہو چکا تھا بہتر تھا کہ مدیر معظم اس کو اسی زمانہ میں شائع فرما دیتے جبکہ وہ اولاً ان کے دائرہ علم میں آئی اس سے غالب کی وطن پرستی کا وہ سارا شور و غوغا ختم ہو جاتا جو ایک عرصہ سے فضا میں گونج رہا تھا۔ غالب کی اس تحریر کے لئے ملاحظہ ہو ضمیمہ (۲) کتاب ہذا۔

حاجت مند نہیں۔ تقریباً تین سال بغیر پنشن اور خلعت کے بڑی عسرت میں گزارے اور اپنے احباب کی کریمانہ نوازشوں پر زندگی بسر کی ہر گھڑی اس کی دلی آرزو تھی کہ پچھلے الطاف تازہ ہو جائیں۔ کوئین وکٹوریہ کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کو ملاحظہ کیجئے نیز وہ خطوط بھی دیکھئے جو اس نے اپنے دوستوں کو لکھے جن میں وظیفہ اور خلعت کی از سر نو اجرائی پر بے اختیار مسرّت کا اظہار کیا گیا ہے۔

اس کے باوجود غالب کے قدردانوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ بڑا وطن پرست تھا اور اسلامی اقتدار کی تباہی سے اس کے دل پر بڑی چوٹ لگی چنانچہ ذیل کے اشعار اس کے دردِ دل کے مظہر بیان کئے جاتے ہیں۔

ہندوستان سایۂ گل پایۂ تخت تھا
جاہ و جلال عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ

ہر داغِ تازہ اک دلِ داغ انتظار ہے
عرضِ فضائے سینۂ دردِ امتحاں نہ پوچھ

گلشن میں بندوبست بہ رنگ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

جو اشخاص ان اشعار کو ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں کا ترجمان سمجھتے ہیں وہ شاید اس سے ناواقف ہیں کہ یہ غدر کے غالباً چالیس سال قبل لکھے گئے (ملاحظہ ہو دیوان غالب قلمی نسخہ بھوپال جو ۱۲۳۷ھ ۱۸۲۱ء میں ترتیب دیا گیا) یہ اشعار واقعہ غدر سے ایسے ہی بے تعلق ہیں جیسے کہ ذیل کے اشعار ؎

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہیں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اس بارہ میں حالی صاحب کا بیان بھی سن لیجئے[1]

"جیسا کہ ان تحریرات سے ظاہر ہے تمام عمر ملکہ معظمہ اور وائسرائوں لفٹننٹ گورنروں اور دیگر حاکموں اور افسروں اور تمام انگلش قوم کی مدح سرائی میں بسر کی بعض افسروں کی وفات پر دردناک مرثیے لکھے اور ہمیشہ فخر کے ساتھ اپنے تئیں وابستگان دامن دولت انگلشیہ سے سمجھتے رہے۔"

---

[1] کریمی پریس صفحہ ۳۷۹ ۔

صوفیانہ رنگ

غالب کے کئی نقادوں نے سنجیدگی کے ساتھ یہ بات بھی بتلائی ہے کہ وہ بڑا صوفی تھا۔ واللہ اعلم! کسی خیال کا ذہنی ادراک اور چیز ہے اور اس میں لبس جانا اور بات۔ اس کے علاوہ ایسے فقرے جو صوفیانہ مسلک کے حامل ہیں غزل گو شعراء کی اوہام پرست دکانِ سخن میں بکثرت موجود ہیں، دیکھئے خود غالب اس خصوص میں کیا کہتا ہے،

"آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف اور کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونیت طبع کے یہاں کیا رکھا ہے۔"

محض اس بنا پر کہ غالب کے اشعار میں صوفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں ہمیں یہ نتیجہ نہیں نکال لینا چاہئے کہ وہ صوفی تھا جب تک کہ اس امر کا یقین نہ ہو جائے کہ اس قسم کے شعر اس کی سیرت، افتاد طبیعت اور عمل کے آئینہ بردار ہیں۔ محقق کلام غالب کو ان پہ سنجیدگی سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ حقیقی صوفی وہ شخص نہیں ہے جو صرف مذہب تصوف کو مانتا ہے

بلکہ وہ شخص ہے جو اندرونی طور پہ اس کو محسوس کرتا اور اپنے تمام افکار اور اعمال کو اس کے مطابق رکھتا ہے۔ ہر چیز جو موجود ہے، ہے۔ کوئی شئے بے محل نہیں۔ ہر چیز بذات خود خیر ہے۔ سب اس کی مرضی و مشیئت کے مطابق ہے۔ وہ اس کا عالم ہے اور اس کو معرض بحث میں لانا اس کی ذات سے انکار کرنا ہے اس سے محبت کرنا اور یہ محسوس کرنا کہ جو کچھ ہے اس کی ذات سے ہے اور خیر ہے، ایک صوفی کی اصل زندگی ہے اس کی مشئیت میں چون و چرا کرنا اور تسلیم و رضا سے منہ موڑنا صوفیانہ شان کے بالکل خلاف ہے۔ غالب اور اس کے فلسفہ کا امتحان کرتے وقت محقق کو یہ باتیں ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئیں۔

بعض ایسے حضرات بھی ہیں جو غالب کو کئی چیزوں کا حق دار سمجھتے ہیں جن میں اس کی "قومی رجائیت" کسی طرح کم اہم نہیں اس بحث کی تائید میں اس کے دیوان سے اشعار بھی پیش کئے گئے ہیں جن پہ محقق کو غائر نظر ڈال کر یہ معلوم کرنا چاہئے کہ ان اشعار کی نوعیت تخلیقی ہے یا خالص وجدانی۔ شکسپیر نے بیسیوں بدمعاش پیدا کئے، لیکن ادبیات کا کوئی ذی فہم محقق یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ خود بھی ایک بدمعاش تھا۔ شاعر حالات کے سانچہ میں ڈھل

جاتا ہے اور تخیل کے بل پر گوناگوں احساسات اور کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے، جن میں خود اس کی شخصیت کا کوئی رنگ نہیں پایا جاتا۔ الفاظ کا جامہ پہنتے ہی وہ شاعر کی ذات سے الگ ہو کر اپنا مستقل وجود قائم کر لیتے ہیں وہ کلام البتہ اس سے مختلف ہے جس میں بار بار ایک ہی راگنی سنائی دیتی ہو اور جس کی یک رنگی اور وضع داری سے پتہ چلتا ہو کہ وہ شاعر کی زندگی یا شخصیت ہی کے خمیر پر تعمیر ہوا ہے۔ غالب کے زاویہ نگاہ کی جانچ پڑتال کے لئے ہمیں اسی قسم کے اشعار و غزلیات سے سروکار ہے۔ اس کی تخلیقی شاعری پر فن و کمال پر بحث کرتے وقت توجہ کی جائے گی۔

ہم نے اوپر ان نمایاں اجزا کو بیان کر دیا ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف صورتوں میں غالب کے حیاتی زاویہ نگاہ کو ترقی دیتے رہے اب یہ معلوم کرنا محقق کا کام ہے کہ ایک جزو دوسرے اجزا پر کس طرح عمل اور ردّ عمل کرتا رہا لیکن اس سے جو بھی نتیجہ نکلے، اور مختلف اجزا، یعنی اندرونی اور بیرونی اثرات جس تناسب میں بھی ملے جلے نظر آئیں محقق کا اس نتیجہ پر پہنچنا یقینی ہے (بشرطیکہ وہ اعتقاد کی رو میں نہ بہہ جائے)

کہ ایک عنصر باقی تمام عناصر پہ چھایا ہوا ہے اور وہ شاعر کی بے اطمینانی ہے۔ اس بے اطمینانی کو ہم قبل ازیں مردم بیزاری سے موسوم کر چکے ہیں۔ لیکن آخر اس کی بنیاد کیا تھی۔ کیا یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ اس کے نزدیک دنیا ایسے نااہلوں سے آباد ہے جو اس کے تخیل کی بلندیوں تک اس کا ساتھ نہیں دے سکتی اور اگر یہی بات تھی۔ تو اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہونا چاہئے تھا اور پھر اتنی سی بات پہ مبدء فیاض سے شکوہ گذار ہونے کے کیا معنی؟ طبیعت کا یہ رنگ کہیں اس وجہ سے تو نہیں پیدا ہو گیا تھا کہ بعض قریبی عزیزوں کی وفات نے اس کی خانگی زندگی کو تلخ اور ناگوار بنا دیا تھا اگر یہ واقعہ ہے تو پھر وہ شوخی وہ ظرافت کہاں سے آگئی۔ جس کو حالی اس کا رفیق دائمی بتاتے ہیں؟ اس بے اطمینانی کا اصل سرچشمہ آخر کار کیا قرار پا سکتا ہے۔ ذیل کے اقتباس ملاحظہ ہوں۔

"میں نے نواب مختار الملک کو قصیدہ بھیجا کچھ قدردانی نہ فرمائی روداد یہ ہے ایک مثنوی جو سابق میں لکھی تھی وہ محی الدولہ

کو بھی، رسید بھی نہ آئی۔ ایک کم ستر برس کی عمر ہوئی سوائے شہرت خشک کے فن شعر کا پھل نہ پایا۔ فرمان وہاں عصر ہے مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔"

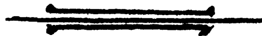
"بو علی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی راحت درکار ہے، اور باقی حکمت و سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہیں۔ ہندوستان میں کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گمنام جئے تو کیا کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی باقی سب وہم"

"انوری نے بارہا ایسا کیا کہ ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام ہبہ کر دیا میں نے باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام ہبہ کر دیا تو کیا غضب ہوا۔ اور پھر کیسی حالت اور کیسی مصیبت میں۔ اس قصیدہ سے مجھ کو غرض دستگاہ سخن منظور نہیں، گدائی منظور ہے۔

"حضرت زبدۃ العلماء کا اب تک وہاں نہ پہنچنا تعجب کی بات ہے حق تعالیٰ ان کو جہاں ہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ جب

جائیں وہاں پہنچیں ۔ میرا مقصود تو اتنا ہے کہ قصیدہ گزرے اور
کچھ ہمارے تمہارے ہاتھ آئے ۔

ایسے بیسیوں اقتباسات دیئے جا سکتے ہیں بہرحال اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب میں عظیم الشان قوتیں ودیعت کی گئی تھیں لیکن ؎ ہم خدا خواہی وہم دنیائے دُوں، کے بمصداق نہ تو اس کو وہ چین اور سکون ہی نصیب ہوا۔ جس کا وہ اس قدر آرزومند تھا اور نہ وہ امتیاز ہی حاصل ہو سکا جو اس کے اعلیٰ قابلیتوں کے مطابق ہوتا ۔



باب ششم

پُرعظمت شاعری

"اگر تو واقعی قدرت کے نورانی سرچشمہ سے فیض اٹھاتا ہے
تو اے شاعر! اٹھ اور خدا کے دیئے ہوئے نور کے مطابق اپنے مقام
پر جلوہ گستر ہو اور رہین قناعت ہو جا۔"

"قوی ہیکل ستارے اور وہ جو منتہائے بلندی سے نور برساتے ہیں
دگو صرف آدھی دنیا ان کو دیکھ سکتی ہے اور بقیہ نصف عالم صرف
ان کے وجود کا علم رکھتا ہے) اس تنہا ستارے سے زیادہ لطیف
اور حامل شان الٰہی نہیں۔ جو کسی بھیانک پہاڑ کی چوٹی پہ آپ ہی آپ
روشن رہنے والے شعلۂ ہدایت کی طرح فروزاں رہتا ہے"

" اور نہ ان ننھے ستاروں سے ، جو بے برگ و بار درختوں کی ٹہنیوں میں موسم سرما کی جھلملاتی شمعوں کا نقشہ پیش کرتے ہیں ۔"

" یہ سب ایک ہستی واحد کے غیر فانی چشم و چراغ ہیں ۔"

" تو پھر اے شاعر! اٹھ اور خدا کے دیئے ہوئے نور کے مطابق اپنے مقام پر جلوہ گستر ہو اور رہین قناعت ہو جا۔" (ورڈسورتھ)

ورڈسورتھ کی بتائی ہوئی یہی وہ ربانی تجلی ہے جو شاعری کی جان ہے ۔ خدا کی یہ دین کسی کو زیادہ نصیب ہوتی ہے تو کسی کو کم، بعض قوی ہیکل ستاروں کی آن سے جگمگاتے ہیں تو بعض بے برگ و بار درختوں کی شاخوں میں ، سرما کے ٹمٹماتے ستاروں کی "تنک تابی" کا نقشہ پیش کرتے ہیں ۔ بہرصورت ہر شخص بشرطیکہ وہ واقعی شاعر ہو ، ایک ہی سرچشمہ سے اکتساب نور کرتا ہے ۔

یہ نور شاعر کے دل و دماغ کو اپنا بسیرا بنا لیتا ہے ۔ جہاں وہ مادرانہ محبت سے اس کو پالتا پوستا رہتا ہے ۔ اس تاریکی کو دور کرتا ہے جس میں ذہن انسانی گھر جاتا ہے اور پھر اس کو رازِ زندگی کے سمجھنے کے قابل

بنا دیتا ہے۔ لیکن ہر شاعر اس ماتا بھری پرورش اور تربیت کو قبول نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ یہ عظمت شاعری کا راستہ بڑا کٹھن اور دشوار گزار ہے بعض خدا کے بندوں کو عمر بھر اس نور کا احساس نہیں ہوتا بعضوں پہ تاریکی کے اتنے گہرے پردے پڑ جاتے ہیں کہ وہ اس تجلی سے بہرہ اندوز ہی نہیں ہو سکتے۔ زمرۂ اوّل کے شعراء شعر تو کہتے ہیں۔ لیکن اس کاربّانی پہلو ان کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے اور انہیں اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ زندگی میں اس کا کیا حصہ ہے۔ وہ زندگی میں لطف ضرور اٹھاتے ہیں لیکن ان کی لطف اندوزی، ایک بچہ کی خوشی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اس میں وہ اہمیت کا کوئی خاص سامان نہیں پاتے۔ بسنتی گلاب ان کی نگاہوں میں ایک نظر فریب زرد رنگ کا پھول ہے۔ اور بس۔ ایسے شاعر اپنے حال میں خوش رہتے ہیں اور انہیں آگے کی طرف قدم بڑھانے کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ دوسرے زمرہ کے شعرا گویا طفلانِ ظلمت ہیں ان میں اگر کوئی اظہار خیال پہ قادر بھی ہوتے ہیں تو وہ قدرت کے اس عطیہ کو انسان کے کثیف جذبات کی ترجمانی میں صرف کر ڈالتے ہیں۔

بعض ایسے بھی ہیں جنہیں اس تجلی کا پیاس گزارانہ احساس ہوتا ہے وہ اس سفر کے لئے کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں جس کی آخری منزل خدا کی بستی ہے۔ یہاں وہ اس ہم آہنگی کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں جس کو وہ اندر ہی اندر محسوس کرتے رہے ہیں اور جس کی نورانی کرنیں چھن چھن کر تمام عالم میں پھیلتی رہتی ہیں لیکن ہر کوئی اس منزل تک نہیں پہنچ سکتا اپنے اپنے ظرف نور کے مطابق ہر شخص زور لگاتا ہے بعض اپنے پیمانۂ نور کے ختم ہوتے ہی راستہ میں رہ جاتے ہیں اور بعض باوجود اس کے قدم آگے بڑھا کر تاریکی میں گم ہو جاتے ہیں بعض اس ظلمت یعنی "زندگی کے خوفناک ہجوم غم" سے اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ انہیں کچھ نہیں سجھائی دیتا۔"

" امید کا آسرا اور تاب و تواں کی نعمتیں، میں، کہاں سے لاؤں۔ دل میں طوفان اضطراب اور عالم خارج میں ایک ہنگامہ بپا ہے۔

قناعت کی دولت بیدار بھی میرے مقسوم میں نہیں جس کو اہل حال اپنے مراقبوں میں ڈھونڈھ پاتے ہیں اور اس شان سے نکلتے ہیں کہ روحانی فتح کا تاج ان کے زیب سر ہوتا ہے۔

" شہرت و اقتدار اور محبت و آرام کی لذتوں سے میں ناآشنا ہوں وہ لوگ ایک ایک کر کے میری نظر کے سامنے ہیں جو ان چیزوں میں بسے ہوئے ہیں۔ ہنس بول کر جیتے اور زندگی کو سازعشرت سمجھتے ہیں لیکن کیا بتاؤں کہ مجھے قدرت نے زندگی کے اور ہی گھونٹ پلائے! اب یاس و حرماں ہوا اور پانی کی طرح میرے لئے نرم اور شیریں بن گئے ہیں۔ ایک تھکے ہوئے بچے کی طرح میں اس جنجال کی زندگی کو رد رد کر اپنے آنسوؤں سے بہا سکتا ہوں تا آن کہ موت دبے پاؤں نیند کی طرح مجھ پہ چھا جائے ہوا کی گرمی میں میرے گال ٹھنڈے پڑنے لگیں اور سمندر کی آخری تان میری مائل بہ پروا نزدرح پہ ٹوٹ جائے،، (شیلی)

سمندر کی یہ تان آخری نہیں بلکہ ابدی ہے!

ان اسیران رعب میں سے بعض الٹے پاؤں جہاں سے چلے تھے وہیں آ رہتے ہیں۔ ذرا عقل ٹھکانے لگتی ہے تو اپنے المناک تجربہ پہ غور کرنے لگتے ہیں۔ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی ایک معمہ ہے، لیکن تسکین کی صورت نکالنی بھی ضروری ہے۔ اس لئے وہ فکر و تخیل کی ایک مثالی دنیا میں پناہ گزیں ہو جاتے ہیں۔

چند ایسے بھی ہیں جو اپنے "نور" کو مدہم پڑتا دیکھتے ہیں تو ان کا دل بیٹھ جاتا ہے لیکن پھر اس خیال سے ڈھارس بندھتی ہے کہ آخر اوروں نے اس منزل کو جا ہی لیا۔ اس بنا پہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر اور نور ان کے حصہ میں آگیا تو وہ بھی اپنے مقصد کو پالیں گے وہ آگے بڑھ کر خطرہ میں پڑنا نہیں چاہتے اور نہ ان کے قدم پیچھے کی طرف پلٹتے ہیں کیوں کہ ارباب بازگشت کے مقابلہ میں انہیں زیادہ "ذوق یقین" حاصل ہوتا ہے وہ ستم کش امید و انتظار رہتے ہیں۔

" اے دوست۔ دیکھتا! تیری اور ہماری زندگی میں کتنا بیّن فرق ہے۔ ہم ہیں کہ بغیر کسی مقصد و منشاء اور احساس وقت کے بہے چلے جارہے ہیں ہر شخص کوشش میں مصروف ہے لیکن اس کے مآل سے ناآشنا۔ وہ سورنگ کی زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن ہر زندگی ادھوری۔ تیری طرح محو انتظار بھی رہتا ہے۔ لیکن اس میں تیری سی شان امیدواری کہاں۔"

" تو جلوۂ طور کا منتظر ہے اور ایک ہم بھی ہیں جو عارضی ملتوں کے نیم پرستار ہیں جن کے احساس میں گہرائی اور ارادوں میں صفائی

نہیں جن کی بصیرتوں نے عمل کے پھل نہیں چکھے اور دھندلے خواب وخیال تکمیل سے بے نیاز رہے۔ جنھیں ہر سال نئے غم اور نئے سامان دیئے جاتا ہے۔ جو اپنی زندگی کو تذبذب میں گنوا دیتے ہیں اور آج کی کمائی بے دردی سے کل لٹا دیتے ہیں۔ سچ بتا اے خانہ بدوش! کیا ہم اس نور کے انتظار میں نہیں بیٹھے رہے؟

ہم بے شک بلا کش انتظار ہیں لیکن وہاں حجاب ہے اور یہاں درماندگی پھر ہم میں کا وہ شخص جس نے سب سے زیادہ درماندگی کے مزے چکھے ہیں بیزار اور ہراساں ہو کر عقل کے تخت پہ متمکن ہوتا ہے۔ ایام غم کے تمام تلخ تجربوں کو ایک ایک کر کے بے نقاب کرتا ہے اور جی کے جنجال کے آغاز و ارتقا اور نشانات کی ساری کہانی بیان کر دیتا ہے اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ امید کے بجھنے والے شرارے کو وہ کس طرح چمکاتا رہا پہلو میں دل کو سمجھاتا اور ادھر عقل کی فہمائش کرتا رہا۔ غرض وہ گھڑی گھڑی کی تسلیوں کا ایک دفتر کھول دیتا ہے۔

لیکن یہ صرف ارباب عقل کا شیوہ ہے۔ ہمارے حصہ میں تو پچھتانا لکھا ہے۔ ہم آرزو کرتے ہیں کہ جلد ہمارے خواب

پریشاں کا خاتمہ اور رحمتوں کا نزول ہو۔ ہم دم بخود ہو کر صبر کے ساتھ سب کچھ سہے جاتے ہیں۔ تلخیٔ صبر بھی کیا بلا ہے گویا نامرادی کی دیوار سے لگی کھڑی ہے۔ لیکن اے دوست! کسی میں بھی امید کی وہ شان نہیں پائی جاتی جو تجھ میں ہے۔" (آرنلڈ)

ان میں سے بعض فضول انتظار کشی کی زحمت میں مبتلا رہتے ہیں پھر بھی وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

"ہاں اب بھی ہم امیدوار ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہر حال میں شر کی آخری منزل، خیر ہی ہے۔ ضمیر کی ملامتیں، ارادوں کی لغزشیں، دل کے وسوسے اور طبیعت کی خامیاں خیر ہی پہ ختم ہوں گی۔"

"کوئی چیز بے مقصد جادہ پیما نہیں۔ حیات کی کوئی چھینٹ ضائع نہیں جائے گی اور نہ وہ بے کار سمجھ کر سپرد عدم کر دی جائے گی۔ جبکہ خدا نے یہ کارخانہ مکمل بنایا ہے۔"

"پتنگے کی ننھی سی جان بھی یوں ہی وجود میں نہیں آگئی اور نہ جگنو بغیر کسی مقصد کے نور کی بے محل چنگاری اپنے ساتھ

لئے لئے پھرتا ہے۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ مآلِ حیات رکھتے ہیں
یا کسی اور عامل مقصد کی خدمت گزاری میں مصروف
ہیں۔"

"دیکھنا! ہر چیز ہماری نگاہوں سے مستور ہے لیکن میرا
ایمان تو یہی ہے کہ منزلوں دور ہی سہی انجام کارہ خیر"
ہمارے گلے کا ہار بنے گا۔"

"یہ ہے لڑی میرے خواب کی لیکن خود میرا کیا حال ہے۔
میں ایک بچہ کی طرح رات کی تاریکی میں نور کے لئے بلبلا
رہا ہوں جس کے بس میں سوائے اس رونے کے کوئی اور
چیز نہیں۔"

صرف چند ہی افراد ہیں جن کا سفر بالآخر انجام کو پہنچتا ہے
یہی وہ لوگ ہیں جو زندگی بلکہ کل کائنات کی زندگی کے احساس
ہم آہنگی سے لذت آشنا ہوتے ہیں۔ یہی لوگ حقیقی معنوں
میں بڑے ہوتے ہیں بلا لحاظ اس کے کہ معاشرت میں ان
کا کیا رتبہ ہے۔ مانا کہ وہ شاعر نہیں اور شاعرانہ اظہار کی
قوت بھی نہیں رکھتے۔

"میں اس دربار میں ہوں جہاں اعلیٰ خیالات کی خوشی مجھے رہ رہ کر

گدا گدا تی ہے ۔ وہ حسن لطیف مجھ سے ہم کنار ہے جو کسی گہری چیز سے لبریز ہے ۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں، سمندر کی موجیں، جیتی جاگتی ہوا اور انسان کا کاسۂ دماغ اس کا نشیمن ہے وہ کوئی بیتاب سی چیز ہے جو ہر ذی ہوش اور ہر پیکر خیال میں اور کائنات کی ہر شئے میں سمائی ہوئی ہے۔"

یہ چیزیں بعضوں کو ایمان و ایقان سے حاصل ہوتی ہیں اور بعض غور و فکر یا ایمان و غور دونوں سے حاصل کرتے ہیں۔

"ہوا کمہار کے اس چاک کو دیکھنا۔ کیسا بلیغ استعارہ ہے! غور تو کرو کہ گردش ایام میں ایسی تیزی کہاں سے آگئی اور یہ مٹی کا ڈھیر اس کے ہاتھوں کیسے مجبور اور بے بس ہو گیا کبھی اس رند خراب حال کی اس بات کو بھی تو نے کان دھر کر سنا کہ زندگی ایک چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ ہر چیز پابند تغیر ہے ۔ ماضی تو چل بسا ۔ اب حال کو تو کم از کم اپنا بنا لے ۔"

"نادان انسان! جانتا بھی ہے کہ جوہر حیات کو بقائے دوام حاصل ہے ۔ ماضی اپنی داستانیں دہراتا رہے گا اور زمین

کینچلیاں بدلتی رہے گی۔ لیکن خدا اور تیری روح ایک حقیقت محکم ہے تجھ میں جو چیز سما گئی وہ پہلے بھی تھی، اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی زمانہ کا چاک خواہ رک جائے یا پیچھے کی طرف دوڑنے لگے کمہار اور اس کی مٹی کو بقا حاصل رہے گی۔"

"اس نے تجھے موم سے نازک ماحول کی آغوش مضطرب میں دے دیا تیرا جی تو بہت چاہتا ہوگا کہ زمانہ کی چال کو اپنی مٹھی میں بند کرے لیکن جانتا بھی ہے کہ اس کا منشاء کیا ہے۔ یہ تیری روح کی سنوار کا ایک آلہ ہے جو جی بھر کر تیرے نقش ونگار بناتا اور آخرکار تکمیل کے روپ میں تجھے ڈھال نکالتا ہے۔

"گردش جام میں اگر شباب کی سرمستیوں اور عاشقانہ رموز کے دل نشین جلوے پیش نظر نہ ہوں تو کیا مضائقہ۔ اب اگر بڑھاپے کے ڈراونے منظر نگاہ عبرت بین کے سامنے آجاتے ہیں۔ تو کیوں ڈرتا ہے، تجھے ان جھمیلوں کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا۔"

"ذرا اوپر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ کہ آخر اس ساغر کا مصرف کیا ہے۔ جوانی کی رنگین محفلوں کو بھلا بھی دے۔ نئی

شراب اُبل اُبل کر کف آلود ہو رہی ہے اور آقا، کا چہرہ فروغ مے سے گلستان" بنا ہوا ہے تو خاص دستِ قدرت کا بنایا ہوا۔ ایک مکمل ساغر ہے تجھے زمین کے اس چاک سے کیا واسطہ۔"

" اے خالق کار ساز تو تو اب بھی ہم غریبوں کا ملجا و ماویٰ ہے زندگی کے طوفان اور عالم رنگ و بو کی ہر منزلِ حیات میں میں نے تیرا دامن نہیں چھوڑا مقصد آفرینش کو کبھی دل سے نہیں بھلایا اور ہمیشہ تیری لو میں لگا رہا۔"

" اب یہ تیری دست کاری تیرے حضور میں پیش ہے تو اسے ذرا ٹھونک بجا کر دیکھ لے۔ اگر کچھ بل رہ گیا ہو تو اسے نکال دے اور اگر تیرے منشار کے خلاف اس میں کوئی خس و خاشاک آ گئے ہوں تو ان سے پاک کر دے۔ میرا پیمانۂ حیات تیرے ہاتھ میں ہے تو اسے اپنی مشئیت کے مطابق صورت تکمیل عطا فرما۔"

" خدا کرے کہ بڑھاپا جوانی کا خیر مقدم کرے اور موت اس کو تکمیل کا آخری پیغام سنا دے۔" (براوننگ)

جب ایسی ہم آہنگی حاصل ہو جاتی ہے تو انسان کا ذہن "حسین پیکروں کی جلوہ گاہ" بن جاتا ہے اور اس مقام پہ شاعر ایک خاص کیفیت میں چور رہو جاتا ہے۔

" وہ کیفیت مسعود جس میں اس پہ اسرار کائنات کی گہرائیاں ہلکی پڑنے لگتی ہیں یہ وہ لطیف کیفیت ہے جس میں محبت، نرمی و تیز اکت سے یہاں آگے بڑھ جاتی ہے تا آں کہ ہمارا پیکر خاکی سہم جاتا ہے۔ اور اس کے خون کی گردش رک جاتی ہے۔ جسمانی حیثیت سے ہم سو جاتے ہیں لیکن ہماری روح بیدار ہو جاتی ہے۔ ہمارے دیدۂ منتظر کو ہم آہنگی کے تماشے اور مسرت کے بھرپور جذبے سے سکون و قرار حاصل ہوتا ہے پھر کائنات کے سارے حجاب چاک ہو جاتے ہیں۔ "

انسان کا ذہن جب یہ شان اختیار کر لیتا ہے تو وہ اپنے لطف و تفکر کی خاطر تمام کائنات کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

" مجھے کبھی دھندلکے میں بساط زمین پہ چلنا پڑتا ہے۔ اور کبھی ڈوب کر انتہائی گہرائیوں میں جانا پڑتا ہے جہاں فلک الافلاک بھی ایک حجاب معلوم ہوتا ہے۔ پست و بلند کی اس

سیر میں کہیں قوت و جبروت، اور کہیں خوف و دہشت شکل
و صورت کے مہیب پردوں میں نظر آتے ہیں جن کا ظہور
کبھی اجتماعی شان میں ہوتا ہے اور کبھی انفرادی۔ یہودیوں
کا خدائے قہار اہل شور فرشتوں کے اکھاڑے میں کس جلال
سے گرجتا رہتا ہے لیکن میں ان سب سے بلا کھٹکے گزر
جاتا ہوں کوئی حالت انتشار میرے دل میں خوف نہیں
پیدا کرتی۔ جہنم کا سب سے تاریک اور اسفل طبقہ اور
عالم رویا کا بھیانک سے بھیانک مقام مجھے خوف زدہ
نہیں بنا سکتا۔ لیکن جب میں اس ذہن انسانی پہ نظر
ڈالتا ہوں جو میرا نشیمن اور میرے نغموں کی حقیقی بستی
ہے تو میرا دل مارے خوف کے دھڑکنے لگتا ہے۔"

ذہنی فتحمندی کی یہ قوت خاص لوگوں کا حصہ ہے۔ کسی
خاص صنف سخن میں یا کسی خاص مقدار میں عظمت حاصل
کرنی ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس صنف یا مقدار
میں کوئی کمال حاصل کیا جائے۔

شاعری میں احساس ہم آہنگی پہ زور دینے سے ہمارا
ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ شاعر اپنی شاعری التزاماً اس کا اظہار

کرتا رہے۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک آن کی مسرت یا احساس کی ترجمانی کرے اور چپ ہو رہے۔ کوئی شخص محض اس بناء پر اس کو شاعروں کی صف سے جدا نہیں کر سکتا کہ جن چیزوں کو وقتاً فوقتاً محسوس کرتا رہا یا جن سے وہ محظوظ ہوتا رہا ہے وہ ان کی تنظیم یا تعبیر نہیں کرتا لیکن اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ شاعروں میں اس کو کیا درجہ حاصل ہے تو لامحالہ اس کو ایسے شاعر کے مقابلہ میں کم درجہ دینا ہوگا جو نہ صرف اپنے تجربات سے محظوظ ہوا ہو بلکہ ان پر غور و خوض بھی کرتا رہا ہو۔ نیز اپنے ذہن میں "ہم آہنگی" کا ایک احساس پیدا کر لیا ہو۔ جس کی روشنی میں وہ اپنے سارے تجربات کی جانچ پڑتال کر کے ایک "انتہائی کوشش" میں اس کو عالمگیر اور مثالی قالب عطا کرتا ہے۔

یہ انتہائی کوشش شاعری کا ایک تعین کن جزو ہے کہ کوئی شخص ایک بڑے احساس ہم آہنگی کے زیر اثر ایک بڑا شاعرانہ تجربہ محسوس کرے۔ لیکن تا وقتیکہ یہ تجربہ بصورت الفاظ اعلیٰ شعری روپ میں ظاہر نہ ہو ہمیں اعلیٰ قسم کی شاعری نہیں حاصل ہو سکتی۔

اس "انتہائی کوشش" کے لئے ضروری ہے کہ ایک انتہائی گھڑی بھی نصیب ہو اس وقت گویا شاعر کی زندگی کے تمام تجربات گھل مل کر ایک ایسے جامع تجربہ میں سما جاتے ہیں جو تمام تجربات کی بو باس لئے ہوئے ماورائی شان اختیار کر لیتا ہے۔

ایک شاعر طرح طرح کے تجربات محسوس کر سکتا ہے اور ان میں کا ہر تجربہ اس کے ذہن کے ایک پہلو کا آئینہ بردار ہو سکتا ہے۔ اس پہلو کی ترجمانی بجائے خود موثر اور خوش گوار ہو سکتی ہے لیکن ہر ایسے اظہار میں عظمت کا پایا جانا ضروری نہیں۔ مثال کے طور پر ورڈس ورتھ کو لیجئے اس نے بہت سی نظمیں لکھیں۔ لیکن ہر نظم میں اس کی عظمت کا اظہار نہیں ہوتا۔ اس کی بعض نظمیں بے انتہا خشک ہیں "اکسکرشن" "پریر" میں جو شاعر کی ایک واقعی کوشش کا نتیجہ ہے۔ ایسی بے نمک نثر کے نمونے ملتے ہیں جو صرف بحر کے سانچے میں ڈھال دیئے گئے ہیں اس قسم کی کوتاہیاں کسی طرح بھی شاعر کے اس کمال کو نہیں چھپا سکتیں جو اس کو "اوڈ آن اِمّار ٹیالٹی" (نغمۂ بقا) جیسی نظموں میں حاصل ہوا ہے اس قبیل کی نظموں میں شاعر کا جامع تجربہ

کارفرما ہے۔ اعلیٰ گھڑیاں انتہائی گھڑیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور اعلیٰ سُر ایک اعلیٰ نغمہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

اِس طرح ایک بڑا شاعرانہ تجربہ بڑھتے ہوئے احساس ہم آہنگی سے شیر و شکر ہو کر اعلیٰ شعر کی صورت میں ٹپک پڑتا ہے اور یہی شاعر کو ایک بڑے شاعر کے درجہ پہ فائز کرتا ہے

اب ہم پھر غالب کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔



باب ہفتم

غالب کی شاعری

کلام غالب کا اگر غور سے معالعہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ اس کا اصلی رنگ ذہنی اور دماغی ہے۔ زندگی بھر شاعر کی یہ آرزو رہی کہ وہ فکر و اظہار میں اچھوتا معلوم ہو۔ اور ایک لحاظ سے اس کا یہ مقصد پورا بھی ہوا۔ لیکن اس سے اس کی شاعری ماری گئی اس کے اردو کلام میں شاعری سے زیادہ فن بلکہ صنعت گری نمایاں اور احساس سے زیادہ فکر و تخیل یا خیال آرائی کے آثار پائے جاتے ہیں جہاں احساس کے نشان پائے بھی جاتے ہیں وہاں عقل کا رنگ چڑھانے کی محسوس کوشش ظاہر ہوئی جاتی ہے۔ حال کی اردو تنقیدوں نے غالب کو عجیب و غریب قوتوں سے

مالامال کر دیا ۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے شاعرانہ لطف کی خاطر وہ تمام کائنات کو اپنی آغوش میں لیئے ہوئے ہے ۔

" لوح سے تمت تک مشکل سے سو (۱۰۰) صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں ہے کون سا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے ۔"

یہ چیز رہ رہ کر فضا میں گونجتی رہتی ہے ۔

رہا دیوانِ غالب کی کہانی سیدھی سادھی ہے ۔ ہر زمانہ میں غزل گو شعرا نے شیخ و برہمن کی پھبتیاں اڑائیں صوفیوں اور فلسفیوں کی شان اختیار کی ۔ فلک پہ شکایتوں کے تیر برسائے اپنی شاعرانہ برتری کے گیت گائے ۔ عاشقی کا سوانگ بھرا ۔ ساغر کے دور چلائے اور اسی قسم کے بہت سے تماشے کئے غالب نے اس پامال راستہ سے کچھ زیادہ کنارہ کشی نہیں کی وہی پرانے موضوع اس کو اپنی شاعرانہ جولانی کے لئے ہاتھ آئے البتہ ان پر اس نے عقل کے نئے پردے ڈال دیئے اگر اس نے کوئی نئی زمین تلاش بھی کی تو وہ یاس و حرمان کی زمین تھی ۔ نئی زمین تلاش کرنے سے ہماری یہ مراد ہے کہ حرمان نصیبی کے پرانے موضوع نے اس کی اندرونی

بے اطمینانی سے ایک شخصی رنگ اختیار کر لیا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں وہ الگ کھڑا ہوا نظر آتا ہے اور ایک ایسے شخص کی تصویر پیش کرتا ہے جو زندگی کے مادی پہلو سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ لیکن حالات اور دنیاوی خواہشات پر مسلط ہونے والی دیویاں اس کی راہ میں حائل ہیں۔

کلام غالب تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا حصہ ان اشعار پر مشتمل ہو سکتا ہے جو رسمی طرز میں علانیہ ذہنی مشق کا نتیجہ ہیں۔ یہی وہ بلند پروازیاں ہیں جو غزل گوئی کا میدان جیتنے کی خاطر شاعر نے دکھائیں اور جن کا ذکر حالی نے یادگار غالب میں کیا ہے۔ یہاں شاعر غزل گوئی کے وہی پرانے ڈگر سے گزرتا نظر آتا ہے۔ وہ کبھی پھبتیاں اڑانے میں مصروف ہے تو کبھی عاشق کے روپ میں جلوہ گر ہے۔ کبھی صوفی بنتا ہے اور کبھی فلسفی۔ غرض کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ لیکن چونکہ وہ جدت طرازی پر تلا ہوا ہے اس لئے اپنے ذہنی پہلوئے سخن پر عقلی قبا اٹھا دیتا ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی۔ دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے۔ حلقہ میری زنجیر کا

نکوہش ہے سزا فریادئ بے داد دلبر کی — مبادا خندۂ دندان نما ہو صبح محشر کی
رگ لیلیٰ کو خاک دشت مجنوں ریشگی بخشے — اگر بو دے بجائے دانہ۔ دہقاں نوک نشتر کی
پر پروانہ۔ شاید بادبان کشتی مے تھا — ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دور ساغر کی
کروں بے داد ذوق پر فشانی عرض کیا قدرت — کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

کہاں تک روؤں اس کے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے
میری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

ہے عدم میں غنچہ محو عبرت انجام گل — یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے
کلفت افسردگی کو عیش بے تابی حرام — ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن
دست مرہون حنا، رخسار رہن غازہ تھا

دوسرے حصہ کے اشعار ایسے احساسات کے ترجمان ہیں جو ذہن شاعر کے لئے نیم محسوس تھے اور اس کے مخصوص حیاتی زاویہ نگاہ کی پیداوار، جن کو وہ یا تو رسمی لفظیات کا جامہ پہناتا ہے

یا ان کے لئے رنگ برنگ کے لفظی نہ کہیں تماشا ہے

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

وائے واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا لے گیا تھا گور میں ذوق تن آسانی مجھے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل ہے بے اثر پردہ میں گل کے لاکھ جگر پاش ہو گئے

غم دنیا سے گر پائی ہے فرصت سر اٹھانے کی فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائینگے کیا زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے بھی دوام کلفت خاطر ہے. عیش دنیا کا

فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اس زمانے سے کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ　　　دیکھ، خونابہ فشانی میری

تیسرے حصہ کے اشعار ایسے احساسات سے بھرپور ہیں جن کو شاعر نے پوری طرح سے محسوس کیا ہے اور جن پہ ایسا گہرا عشقی اثر چھایا ہوا ہے کہ شاعر ان کو کسی پر تکلف صنعت گری سے پابہ جولاں نہیں کرتا۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　　پھر ترا وقت سفر یاد آیا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا　　　جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　　اب کسی بات پر نہیں آتی

تھی وہ اک شخص کے تصور سے　　　اب وہ رعنائی خیال کہاں

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو　　　حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں　　　چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب　　　تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے   کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

نیند اُس کی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اس کی ہیں   تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں   اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا   عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں   ختم ہے الفت کی تجھ پہ پردہ داری ہائے ہائے

گوش محرومِ پیام و چشم محرومِ جمال   ایک دل تس پہ یہ ناامیدواری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

یہی وہ حصہ کلام ہے جس پہ خالص وجدانی شاعری کا اطلاق

ہوسکتا ہے کیوں کہ زبان کے قالب میں جو شاعرانہ تجربہ جھلک رہا ہے اوس کو حقیقی طور پہ شاعر نے محسوس کیا پہلے حصہ کی طرح اس پہ نہ تو عقلی رنگ چھایا ہوا ہے اور نہ دوسرے حصہ کلام کی طرح خیال آرائی کا رنگ غالب۔

اس میں شک نہیں کہ کلام غالب کے کامل مطالعہ کے لئے ہر حصہ کلام کا اندازہ ضروری ہے لیکن ہماری دلچسپی شاعر کے ہر حصۂ کلام کے ساتھ بدلتی رہے گی جہاں تک رسمی حصہ کلام کا تعلق ہے۔ ہمیں شاعر کے کمال فن کا اندازہ کرنا ہوگا جو ذہنی یا تمثیلی طور پہ ان بنے بنائے احساسات کو پیش نظر کرتا ہے جو اس کے ذاتی تار و پود سے تعلق نہیں رکھتے۔ دوسرے حصہ کلام میں جہاں احساس سے تفنن یا ذہنی شوخیاں دکھائی گئی ہیں۔ خالص وجدانی شاعرانہ تجربہ سے زیادہ لفظی جادوگری نمایاں اور ممتاز ہے۔ آخری حصہ درحقیقت خالص شاعری کا ترجمان ہے۔ جیسا کہ ہر ارتقائی محل کا تقاضا ہے، اس حصہ کے ہر شعر میں، صورت شعر باطنی شاعرانہ تصور سے میل نہیں کھاتی۔ لیکن پھر بھی بحیثیت وجدانی شاعر کے اس کا کمال نہیں ظاہر ہوتا ہے۔

جو لوگ کہ غالب جیسے رسمی اور وجدانی شاعر کے کلام کو ہمارے مجوّزہ حصوں میں تقسیم کرنے کے عادی نہیں ہیں وہ اس کے اشعار کو مختلف حصوں سے چن لیتے ہیں اور اپنے ذہن میں شاعر کی عجیب و غریب تصویر جلوہ گر کر لیتے ہیں۔

ذیل کے اشعار بہت سے معصوم دماغوں میں ہیجان پیدا کر دیں گے پھر ایک شور اٹھے گا کہ یہاں نہ صرف فلسفہ بلکہ ایک عظیم فلسفہ موجود ہے۔ جو فلسفہ کی تاریخ میں اب تک کسی پر روشن نہ ہوا تھا۔ لیکن کیا واقعی ان اشعار میں فلسفہ یا کوئی نئی چیز ہے؟

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

یہ شعر زیادہ سے زیادہ ایک لفظی کھیل معلوم ہوتا ہے جو تصور اس میں پیش کیا گیا ہے وہ بہت ہی معمولی قسم کا ہے اتنا معمولی کہ وشنو اور شیو کی مورتوں اور ان کے گوناگوں مظاہر کے بے علم پرستار بھی ایسے تصور کے حصہ دار ہیں۔ ہر مورت ایک علامت ہے کسی چیز کی جنس کو مادی پیراہن میں ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی اور ہر بے جان مورت اشارہ کرتی ہے کسی ایسی چیز کی طرف جو جان دار ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

تبلایئے اس شعر میں کون سا فلسفہ ہے۔ اگر حیدرآباد سے کسی شخص کو لندن جانے کے وسائل حاصل ہو جائیں اور وہ وہاں پہنچ کر سینٹ پال کی سب سے اونچی چوٹی پر جا بیٹھے تو وہ یقیناً قدیم لندن کی سرزمین پر ایک طائرانہ نظر ڈال سکے گا۔ لیکن اصل مرحلہ تو یہ ہے کہ پہلے وہ لندن جائے اور پھر اس کو وہاں کے مشہور و معروف گرجا پر چڑھنے کا موقع حاصل ہو؟ کیا غالب کو اپنی اس زندگی میں کبھی عرش کے آستانہ تک بھی رسائی ہوئی؟

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں صورتِ اشیا مرے آگے

کیا اس میں کوئی نئی بات پائی جاتی ہے ؟ کسی ہندوستانی جوگی فقیر سے ملیے تو وہ بھی اسی قسم کی میٹھی رٹوں سے آپ کو محظوظ کرے گا۔

ایک کھیل ہے اورنگ سلیماں میرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

اس شعر میں تعلّی کے سوا اور کیا رکھا ہے ؟

اب صوفیانہ رنگ کا ایک شعر لیجیے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہاں لفظی بازیگری کے سوا اور نیا ہے۔ صوفی اپنے عقائد کی کوئی بات اس میں نہیں پاتا اور نہ منطقی کے لئے اس میں کوئی منطق ہے۔

اس نوعیت کی مثالیں کثرت کے ساتھ دی جا سکتی ہیں ان سے صرف یہی ظاہر ہوگا کہ غالب کے معصوم پرستار اس کی شاعری سے نہیں بلکہ اس کے مفروضہ فلسفہ اور قدرت الفاظ سے متاثر ہوئے۔

جب تک غالب کے رسمی اور اصلی اشعار میں امتیاز نہیں کیا جائے گا۔ حقیقی شاعر پہ ہمیشہ نقاب پڑی رہے گی ایک رسمی پہلوئے سخن پہ کتنا ہی عقلی رنگ چڑھایا جائے وہ زیادہ سے زیادہ ایک عقلی پہلو بن سکے گا۔ کوئی فلسفیانہ خیال خواہ وہ نظم ہی میں ظاہر کیا گیا ہو، بہر حال فلسفیانہ خیال ہے۔ اگر رسمی طرز اور فلسفہ شاعرانہ تجربہ سے شیر و شکر ہو کر زور پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ان دونوں کو اس تجربہ کا پابند رہنا ہوگا نہ کہ اسلئے اپنی گرانی سے اس کو بوجھل کر دیا جائے۔

شاعرانہ تحسین کا یہ ایک ابتدائی نکتہ ہے جس سے غالب کے اندھے پرستار واقف نہیں معلوم ہوتے۔ سخن کے عقلی پہلو (جو رسمی طرز اور خصوصاً اس میدان میں ظاہر کئے گئے جس کو حالی عام طور پر شاعر کے فلسفہ اور حکمت سے تعبیر کرتے ہیں) اور اس کی مہارت اظہار ان دونوں نے اس کے پرستاروں کے دلوں کو اس قدر موہ لیا کہ وہ اس امر پہ غور و تامل ہی نہیں کرتے کہ وہ کسی فلسفی یا لفظی صنعت گر سے بحث کر رہے ہیں یا کسی شاعر سے۔ غالب کی لفظی صنعت گری بلا شبہ لایق قدر ہے۔ اگرچہ اس پر قدرت حاصل کرنے کے لئے بھی اس کو خاصا عرصہ لگا۔ جیسا کہ اس کے

دیوان سے جس کو راقم الحروف نے تاریخ وار مرتب کیا، ظاہر ہے۔

اس کا فلسفہ کیا ہے اور وہ کہاں ہے؟ ہر شخص مذہبی فرض کی طرح ادھر اُدھر سے رسمی طرز کے شعر چن لیتا ہے۔ پھر ان کی تشریح و تفسیر کرتا اور ہر شعر میں کوئی نہ کوئی فلسفیانہ خیال پاتا ہے لیکن اب تک کسی نے بھی مختلف خیالات کو جوڑ کر کوئی نظام پیش کرنے کی کوشش نہیں کی جس سے یہ معلوم ہوتا کہ غالب نے آخر فلسفہ کی کیا خاص خدمت انجام دی ہے غالب کا مطالعہ دراصل ایک شاعر کی حیثیت سے ہونا چاہیئے۔ اس کا اپنا زندگی کے متعلق کوئی زاویۂ نگاہ یا بہ الفاظ دیگر فلسفہ حیات ہوگا جس نے اس کے شاعرانہ تجربہ پہ رنگ آمیزی یا اس میں گہرائی پیدا کی ہوگی اگر اس کی تحقیق کرنی ہو تو ان اشعار کو نظرانداز کرنا ہوگا جو رسمی طرز میں عقلی پہلو رکھتے ہیں اور اس کلام کو دیکھنا ہوگا۔ جس میں اس کی اپنی زندگی کی محسوس کی ہوئی چیزیں ایک مستقل راگ اختیار کر لیتے ہیں۔

غالب کے زاویہ نگاہ یا اس کے فلسفہ حیات والے باب میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ شاعر کی روح یا ذہن جس انداز نگاہ سے

متاثر ہوئی وہ بے اطمینانی کی پیداوار ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی آس پاس کی دنیا کو مخالفانہ اور اجنبی نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔ غالب کا حقیقی فلسفہ حیات، دراصل اسی انداز نگاہ میں مل سکتا ہے۔ یہی وہ فلسفہ ہے جس نے اس کے شاعرانہ تجربہ سے گھل مل کر اس کے شاعرانہ اظہار میں ایک امتیازی رنگ پیدا کر دیا۔

کسی شخص کے شاعرانہ تجربہ سے مراد جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے، وہ چیز ہے جس سے وہ شاعرانہ طور پر اپنے ذہن میں لطف اندوز ہوتا ہے یہ لطف اندوزی اس کے باطنی قید و بند کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے کیونکہ جیسا ذہن ہو گا ویسا ہی اظہار ہو گا۔ اور جیسا کہ ہم اگلے باب میں بیان کر آئے ہیں۔ ذہن انسانی انتہائی بلندی اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب کہ وہ زندگی میں "ہم آہنگی" کو پالے۔ یہ عظمت شاعری ایسے ہی ذہن میں جنم لیتی ہے اس وقت شاعر یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ زندگی ہم آہنگی کا مظہر ہے اور اس کا ذہن خارجی دنیا سے مطابقت پیدا کرنے لگتا ہے۔ یہ ہم آہنگی غالب کو کبھی حاصل نہیں ہوئی۔

جب کوئی شخص اپنے ذہن کو خارجی دنیا سے مطابق کرنے

میں ناکام ہوتا ہے تو وہ دو باتوں میں سے کوئی ایک بات اختیار کرلیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ مخبوط الحواس نہ بن جائے بلکہ تسکین حاصل کرنے اور اپنی پریشان روح کو آرام پہنچانے کا آرزومند ہو۔ وہ یا تو بے تحاشا یا چپکے چپکے اپنے آپ کو ایسی ہستی کی آغوش میں دے دیتا ہے جو اس کی آتش محبت کو بھڑکائے۔ اور خود بھی اس آگ میں جلنے لگے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اپنے محبوب کے سوا دنیا میں کوئی چیز اس کی دلچسپیوں کا مرکز نہیں بن سکتی یا اگر ایسا نہ ہو سکے تو وہ دنیا کی ہر چیز سے منہ پھیر لیتا ہے اور ایک خود ساختہ ذہنی زندگی بسر کرنے لگتا ہے جس میں وہ ایک ایسی ہم آہنگی کو مسلط کر لیتا ہے جو اس کی خیال آرائی کو بھلی معلوم ہو۔

"اے دوست آ کہ ہم آپس میں صدق و صفا کی زندگی بسر کریں یہ دنیا جو بھانت بھانت کے جمیل اور نت نئے خوابوں کی سرزمین کی طرح ہمارے سامنے ہے، حقیقی خوشی، لطف و محبت اور نور و تجلی کا کوئی تحفہ ہمارے لئے نہیں رکھتی اور نہ اس میں ایقان و اطمینان کا کوئی سامان اور درد دل کی کوئی دوا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک گھٹا ٹوپ میدان میں ہیں۔

جو رزم و پیکار کی پریشان دہشتوں سے معمور ہے۔ جہاں
بے خبر فوجیں رات کی تاریکی میں ایک دوسرے سے ٹکرا
جاتی ہیں۔"

اس طرح سے بعض لوگ اپنی تسکین کا سامان کرتے ہیں محبت کی بارگاہ میں وہ اپنی زندگی کے تمام مصائب کو بھلا دیتے ہیں۔ یہی ان کا درمان ہے۔

غالب کو یہ تسکین کبھی نصیب نہ ہوئی۔ شباب کے عالم میں اس کو ایک عورت سے لگاؤ ضرور پیدا ہوا جو شاید بازاری تھی۔ لیکن یہ لگاؤ ابھی " الفت کا رنگ " پکڑنے نہ پایا تھا کہ وہ اس جہان سے رخصت ہو گئی اور غالب نے غزل کی صورت میں ذیل کا دل گداز مرثیہ لکھا۔ یہ سانحہ اس وقت پیش آیا جب کہ غالب کی منکوحہ بیوی موجود تھیں اور ان کی شادی کو کوئی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا؟
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے
گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی الفت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

اس کے کئی سال کے بعد اس نے یہ اشعار لکھے :-

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
ایک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنین بتان خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت رُبا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے

اِن سے کسی اور جراحت دل کی بو آتی ہے یہ واردات ظاہر ہے کہ چالیسواں سال کلکتہ کے سفر میں پیش آئی ۔

اس کے ابتدائی سانحہ اور کلکتہ کی یاد دردانگیز کے درمیانی عہد میں بھی غالبؔ کچھ خاموش نظر نہیں آتا۔ اس کی غزل جس کا مطلع یہ ہے ؎

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کئے ہوئے

اور جو کلکتہ کے سفر سے کئی سال قبل لکھی گئی کچھ معنی اپنے اندر ضرور رکھتی ہے۔ بشرطیکہ وہ صرف ذہنی مشق کا نتیجہ نہ ہو۔

سفر کلکتہ کے بعد اس پہ کیا گزری یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ممکن ہے کہ اس نے محبت کی مشق، ڈھلتی ہوئی عمر کے تناسب سے جاری رکھی ہو۔ لیکن اس ڈھلتی چھاؤں میں عشق بازی کے کوئی قطعی اور تاریخی نشان ہمیں نہیں ملتے۔ بہر حال عشق و محبت کی پہلی سرگزشت کے بعد بھی اس نے شاعرانہ طبع آزمائی کی۔ بلکہ وفات کے چند ہی سال پہلے ساٹھ سال کی عمر میں اس نے شعر کہے ہیں۔

ملاحظہ ہو:-

شبِ وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
ہوا ہے موجب آرام جان و تن تکیہ
بنا ہے تختہ گل ہائے یاسمین بستر
ہوا ہے دستہ نسرین و نسترن تکیہ
فروغ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام
جو رخت خواب ہے پروین تو ہے پرن تکیہ

مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا
رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیم تن تکیہ
اگرچہ تھا یہ ارادہ مگر خدا کا شکر
اٹھا سکا نہ نزاکت سے گل بدن تکیہ

اگر یہ اشعار بڑھاپے میں لکھے گئے جب کہ غالب اپنے بستر سے بمشکل حرکت کر سکتا تھا تو یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی یہ شاہدانہ محبت حقیقی اور جیتے جاگتے جذبات عشق سے معرّا تھی ۔لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف ذہنی مشق کا نتیجہ ہے ۔ اگرچہ ایک مقامی مضمون نگار نے رسالہ اردو اورنگ آباد میں ایک دلچسپ نظریہ یہ پیش کیا ہے کہ غالب نے جوانی میں ایک فلسفی کی حیثیت سے زندگی شروع کی اور انسانی عقل و فہم سے بالاتر علم و حکمت کی باتیں سمجھائیں لیکن بڑھاپے کے آخری ایام میں اپنے محبوب اور اپنے ناتواں پوست و استخواں کے درمیان سے تکیہ ہٹانے کی کوشش کرتا رہا ۔

غرض جو بھی حقیقت ہو اور غالب کی حقیقی زندگی میں اس کے عشق و محبت کا جیسا بھی رنگ جھلکتا ہو اس کا محبوب

جس کو وہ اپنی غزلوں میں جلوہ گر کرتا ہے ایک رسمی معشوق بلکہ ناقابل ذکر شاہد بازاری ہے۔

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسّم ہائے پنہاں کا

شب کو کسی کے خواب میں آیا ہے وہ کہیں
دُکھتے ہیں آج اس بُتِ سیمیں بدن کے پاؤں

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کی بازو پہ تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی

بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیے کہ ہاں کیوں ہو

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

در پردہ انہیں غیر سے ہے ربط نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

اس سے سرسری طور پہ غالب کی اس محبت کا تصور ہو سکتا ہے (تاوقتیکہ اس کے خلاف ہمیں کوئی شہادت دستیاب نہ ہو) جو اس کی ذہنی گل گشت اور سیج پیچ مادی معاملات میں ظاہر ہوتی رہی۔ اس کی محبت صاف طور پہ مادی قسم کی ہے اور اس میں کوئی روحانیت نہیں پائی جاتی۔ ایسی محبت جو پژمردگی کے عالم میں جان پروری کرتی اور مکروہات زندگی کو دل سے محو کر دیتی ہے، غالب کے مکمل دیوان میں اس کے کوئی نشان نہیں ملتے۔

وہ لوگ جو اس قسم کی جان پرور محبت سے ناآشنا ہیں اس ناقابل فہم دنیا کے حقائق سے بظاہر اپنے آپ کو بے تعلق کر کے کوئی اور راستہ اختیار کر لیتے ہیں وہ پھر اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنی ایک الگ دنیا میں باطنی طور پہ گھومتے رہیں۔ اپنے ذہنی چین کے لئے وہ "پرومیتھیس ان بونڈ" "ڈینا سٹس" اور اسی قسم کی شاعرانہ تخلیق عمل میں لاتے ہیں۔ اپنے ان اقلیموں میں وہ اس ہم آہنگی کو پا لیتے ہیں جو انسانوں کی بستی میں انہیں نصیب

نہ ہوئی تھی۔

ایسی شاعری جس میں پناہ گزینی کا یہ اندازہ پایا جاتا ہے، گزین شاعری کے نام سے یاد کی جاتی ہے اس کو انسان کی روزمرہ معمولی زندگی سے واسطہ نہیں ہوتا اور اس لحاظ سے اس پہ زندگی کے عالم گیر پہلو کی کوئی چھینٹ نہیں پڑتی۔ خواہ وہ کیسے ہی حسین و جمیل تخیل کی حامل ہو۔ اور ذہن انسانی پہ اس کا اثر کتنا ہی قوی اور طاقتور ہو، اس امر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ ایک خیالی چیز اور تخیل کی مخلوق ہے۔ اسی لئے وہ ان لوگوں کی تسکین دل نہیں کر سکتی جو مصائب کے عذاب میں زندگی بسر کرتے ہیں اس قسم کی شاعری سے ہمیں مسرت ضرور حاصل ہوتی ہے لیکن وہ ہمارے شکوک اور انتشارات کو دور نہیں کر سکتی۔ وہ ہمارے ذہن کو خارجی دنیا سے مطابق نہیں کرتی اور اشیاء عالم کو صحیح تناسب سے دیکھنے کی کوئی صورت ہمارے لئے نہیں نکالتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس شاعری کو جو زندگی کی تعبیر کرتی ہے اور جس کو تعبیری شاعری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے پناہ گزیں

شاعری سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اس تعبیری شاعری میں انسان نہ تو زندگی سے بھاگتا ہے اور نہ اس کو اس کے جور و ستم کے شکار ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اس شاعری میں لذت و آزار، مسرت و غم اور وہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں جو زندگی سے وابستہ ہیں۔ یہ چیزیں اپنے طور پر ہماری زندگی میں داخل ہوتی ہیں اور باطنی قوت ہم آہنگی جو تعبیر کا منشاء ہے ہمیں ان کا احساس کراتی ہے شاعر ان کی معانی کو کھول کر رکھ دیتا ہے جس قدر اس کے سارے تجربات جو بالآخر ایک جامع تجربہ میں سما جاتے ہیں، وسیع اور مختلف النوع ہونگے اسی قدر ان کے مجموعی معانی کی ہم آہنگی بڑی ہوئی ہوگی۔ اسی طرح جس قدر بھی ان معانی کی صورتِ اظہار اور ان کا پیدا کردہ یا حاصل شدہ احساس وحدت بڑا ہوگا، شاعری بھی بڑے درجہ کی ہوگی۔

غالب نے یہ عظمت کبھی حاصل نہیں کی۔ اس کے لئے خود غالب ہی مورد الزام ہے۔ عظمت اس میں موجود تھی لیکن اس نے اپنی خود سری اور زندگی کے تنگ زاویہ نظر سے اس عظمت کو کچل ڈالا۔ اس کی بے اطمینانی خود اس بات

کی مظہر ہے کہ وہ دنیا کو سمجھنے، زندگی کو پرتال نے، اور کائنات کی محبوب چیزوں کو تاڑنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا۔ چاردیواری میں محصور، اوروں سے بے خبر، صرف اپنے حاجت رواؤں پہ نظر جمائے، اور کبھی کبھی روحانی دانشمندی کی جھلک دکھلاتے ہوئے، اس نے اس دنیا میں زندگی بسر کی، ایسی دنیا میں جو شاعرانہ پیداوار ہو اس میں کوئی ربانی تجلی اور الٰہی عظمت کے عناصر مشکل سے پائے جاتے ہیں۔ غرض روحانی ہم آہنگی غالب میں سرے سے لاپتہ ہے۔

اگر وہ ہم آہنگی اس کو حاصل بھی ہو جاتی جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، یہ بات ناممکن تھی کہ غزل جیسی ننھی صنف میں ایک بڑے شاعر کا بڑا تجربہ پوری وسعت بوقلمونی اور جامع معانی کے ساتھ ظاہر ہو سکتا۔

اگر یہ ہم آہنگی اس کے حصہ میں نہ آئی تو کوئی بات نہ تھی کافی ایقان کے ساتھ اگر وہ ایک سچی پناہ گاہ تلاش کرتا اور اپنی بنائی ہوئی مثالی دنیا میں پناہ گزیں ہو جاتا تو پھر بھی شاعرانہ عظمت اس کو حاصل ہو جاتی

گو وہ بہت ہی بلند پایہ نہ ہوتی۔ لیکن اس خصوص میں اس کی انتہائی پرواز کا ما حاصل یہ ہے۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو۔
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا ایک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

یہ ایک دیوانہ کی بہشت ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے ذہن میں اس کی کون سی تصویر جلوہ گر ہوتی ہے۔ بہ حیثیت ایک لفظی صنعت گر کے غالب تمام اردو غزل گو شعرا میں ایک بلند مرتبہ پر فائز نظر آتا ہے۔ اگرچہ جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں، اس چیز پر قدرت حاصل کرنے کیلئے بھی اس کو کافی عرصہ لگا۔ اس قدرت زبان کے نمونے اس کی نثر یعنی مکاتیب ہیں جو پختگیٔ عمر کے نتائج ہیں اس لحاظ سے اس کو اردو نثر کے خانہ سازوں میں شمار کیا

جا سکتا ہے۔ لیکن بحیثیت شاعر کے وہ مبتلائے فریب رہا۔ اس کی شاعرانہ پیداوار میں نہ تو وہ محبت ہے جو حیات آفریں ہوتی ہے نہ وہ ہم آہنگی جو حقائق سے پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ ہم آہنگی جو بپناہ گزینی کے احساس سے ظہور پذیر ہوتی ہے ایک نئے ستارے کی آن میں چمکنے کی آرزو میں وہ اپنے حقیقی منصب کو بھلا بیٹھا۔ اس ربانی تجلی کو جو بہ حیثیت شاعر کے اس کو عطا کی گئی تھی اس نے اپنے ہاتھ سے دے دیا باوجود اس کے یہ تجلی اس سے واصل رہنے کی فیاضانہ کشمکش میں مبتلا نظر آتی ہے اسی لئے اس کے اردو کلام میں کبھی کبھی اعلیٰ ساعتوں کا سراغ بھی ملتا ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

قفس میں مجھ سے روئداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہو جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے کچھ ایسا کہ اٹھائے نہ بنے

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پہ
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خارِ بیاباں پہ

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

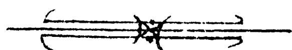
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکہ کھائیں کیا

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
ہوں میں اپنی شکست کی آواز

لیکن ایسی گھڑیاں کبھی کسی بڑی نظم کی صورت میں ظاہر نہیں ہوئیں اور نہ ان کے اعلیٰ سر اعلیٰ نغمہ بن سکے۔ کیونکہ اس نے وہ احساس ہم آہنگی کبھی محسوس نہ کیا جو ایک بڑے شاعر کے لئے ضروری ہے اور نہ وہ زاویہ نگاہ پرورش کر سکا جو ایک بڑے شاعرانہ تجربہ کو ایک بڑی نظم میں ڈھالنا ہے۔

یہ ہے کہانی ہمارے شاعر کی۔ اس نے ایک منتشر زاویہ نگاہ کے سایہ میں منتشر زندگی بسر کی اور ہمارے لئے ایسی شاعری چھوڑی جو خود ہم آہنگی سے معرّا ہے۔ اس کا شمار مشاہیر عالم میں نہیں ہو سکتا۔



ضمیمہ

(۱)

اردو دیوانِ غالب کی تاریخی ترتیب کے سلسلہ میں حسب ذیل مکتوب سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر صدر المہام فینانس حکومت نظام نے از راہ کرم ڈاکٹر ولی محمد معتمد ریاست بھوپال کی خدمت میں میرے لئے تحریر فرمایا تھا۔

ڈیر مسٹر ولی محمد!

ڈاکٹر سید عبد اللطیف، پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

غالب پر ایک کتاب تصنیف کر رہے ہیں۔ کلام غالب کی تحقیق کے سلسلہ میں وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کون کون سے اشعار یا نظمیں دیوان غالب کے اس اصل نسخے (۱۲۳۷ھ) کے حاشیہ پر درج ہیں جو کتب خانہ حمیدیہ میں محفوظ ہے۔

میں اس خط کے ساتھ دیوان غالب کا ایک نسخہ جو مفید عام پریس سے نسخہ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا ہے روانہ کر رہا ہوں۔ اگر آپ از راہ کرم اس نسخہ میں ان اشعار یا نظموں پر نشان لگا دیں جو اصل مسودے کے حاشیہ سے لئے گئے ہیں تو ڈاکٹر لطیف کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب ان لوگوں کے پورے نام بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں جو اس نسخہ اور اصل مسودے کا مقابلہ کر کے متعلقہ اشعار اور نظموں پر نشان لگانے کی زحمت گوارا کریں۔

چونکہ ڈاکٹر صاحب کی تصنیف مکمل ہو چکی ہے اور وہ اس کی طباعت سے قبل دو ایک باتیں صاف

کر لینا چاہتے ہیں اس لئے براہ کرم مرسلہ نسخۂ دیوان بہ عجلت ممکنہ، کوئی ایک ہفتہ میں واپس روانہ کرکے مجھے ممنون فرمایئے۔ امید کہ آپ یہ زحمت گوارا فرمالیں گے۔

مخلص

(شرح دستخط) اے۔ حیدری

اسی قسم کا ایک اور خط مولانا نظامی (صوبہ متحدہ) کی خدمت میں روانہ کیا گیا تھا۔ جنھوں نے دیوان غالب مطبوعۂ نظامی پریس بدایون کے دوسرے ایڈیشن میں یہ بیان فرمایا ہے کہ ۱۲۴۸ھ میں دیوان کا جو مسودہ خود غالب نے ترتیب دیا تھا، وہ بدایونی نسخہ کی ترتیب کے وقت صاحب موصوف کے پاس موجود تھا۔ ان سے یہ استدعا کی گئی تھی کہ نسخہ حمیدیہ کے ایک نسخہ پر ان اشعار یا غزلوں پر نشان لگادیں جو غالب کے مرتبہ مسودہ میں بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر ولی محمد نے تو اصل نسخہ میرے ذاتی مطالعہ اور تحقیق کے لئے روانہ فرما دیا لیکن

مولانا نظامی بدایونی نے سر اکبر حیدری کے مکتوب کے جواب میں ایک خط روانہ فرمایا جس کی نقل ذیل میں درج کی جاتی ہے :-

نظامی پریس ایڈیٹر ذوالقرنین
بدایون۔ یوپی ۳ ردسمبر ۱۹۲۷ء

مکرم و محترم بندہ تسلیم

مجھے ندامت ہے کہ میں تعمیل ارشاد نہ کر سکا اور کتاب کو بجنسہ واپس کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قلمی دیوان جو ۱۲۴۸ھ کے قریب کا لکھا ہوا مجھے ۱۹۱۸ء میں ملا تھا اور جس کا ذکر میں نے اپنے یہاں کے مطبوعہ دیوان غالب کے دوسرے ایڈیشن میں کیا ہے وہ اس وقت میرے پاس موجود نہ تھا۔ بلکہ ایک مرحوم دوست (منشی احمد علی صاحب شوق) کے ذریعہ سے مجھے رام پور میں دستیاب ہوا تھا۔ جس سے میں نے اس وقت کام لیا تھا۔ میں نے ۷ رنومبر کو جو عریضہ

بھیجا تھا اور جس میں میں نے یہ تحریر کیا تھا کہ اس کام کے لئے وقت کی ضرورت ہے اس وقت مجھے خیال تھا بلکہ امید تھی کہ رام پور میں یہ نسخہ مل جائے گا اور اس سے میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کر سکوں گا۔ چنانچہ میں ۱۷ر نومبر کو رام پور گیا۔ اور وہاں ۲۰ر تک مقام کیا اور اس درمیان میں ہر امکانی کوشش نسخہ مذکور کے لئے کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ کتب خانہ رام پور میں بھی یہ نسخہ موجود نہیں بلکہ وہاں ایک نسخہ قلمی ضرور ہے جو ۱۸۵۵ء ([illegible]) کا لکھا ہوا ہے۔ مجھے خیال تھا کہ منشی احمد علی صاحب شوق نے جن کا تعلق کتب خانہ سرکار رام پور سے تھا۔ مجھے نسخہ (۱۲۴۸ھ) کتب خانہ مذکور سے لیکر دیا ہوگا لیکن وہاں نہ ملا۔ اب منشی صاحب کا انتقال ہو گیا اس لئے میں اس کے حصول سے مجبور رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نسخہ ان کا ذاتی تھا یا کسی اور دوست سے لے کر مجھے دیا تھا۔

والسلام

نیازمند

نظامی بدایونی عفی عنہ

نسخہ حمیدیہ جب بدایوں سے حیدرآباد واپس فرمایا گیا تو اس میں کئی اشعار اور بعض جگہ مصرعے بھی سرخ پنسل سے نمایاں طور پر نشان زدہ تھے۔ یہ نہ معلوم ہوسکا کہ یہ نشان کس نے لگائے لیکن (۱۲۴۸ھ) کے نسخہ کی عدم موجودگی میں یہ نشان خواہ وہ کسی کے لگائے ہوئے ہوں الہامی چیز معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ ان سے اکثر جگہ ردیف الف کی غزلوں میں میری تاریخی ترتیب کی تائید و تصدیق ہوتی ہے کلام غالب کے محققین ان معلومات کی روشنی میں اس نسخہ کی تلاش کرسکتے ہیں۔ اس کی دستیابی سے مطالعہ غالب کے کئی مسائل کے حل میں مدد ملے گی۔



ضمیمہ

(۲)

ذیل میں غالب کی اس تحریر کا اقتباس دیا جاتا ہے جس کا ذکر صفحہ (۸۷) کے فٹ نوٹ میں کیا گیا ہے :-

گورنمنٹ میں اس کی بڑی عزت ہے ، اشرفیوں کے عوض قصیدہ مدح نذر دیتا ہے اور سات پارچہ جیغہ سرپیچ موتیوں کے مالے خلعت پاتا ہے۔ اب کی بار جو لاہور میں لارڈ صاحب کا دربار ہوا تو موافق سابق کے درباداروں

کے فہرست کے صاحب کمشنر بہادر حصار سے کہ در نیولا قائم مقام صاحب کمشنر دہلی بھی ہیں مثلاً ورئیسوں کے اور رئیس زادوں کے اس کو بھی خط لکھا۔ بیچارہ بسبب تہی دستی اور بے مقدرتی کے لاہور نہ جا سکا مجھ سے کہتا تھا کہ ستر برس کا آدمی کانوں سے بہرا ہوں اور اکثر بیمار رہتا ہوں۔ لیکن اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں ان عوارض کو نہ مانتا اور بے شک لارڈ صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا، خیر آخر عمر میں یہ ایک داغ حسرت رہا۔ حق بات کو ظاہر نہ کرنا خدا پرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے، اس شخص نے ۱۸۵۵ء کے آخر میں قصیدہ مدح ملکہ معظمہ ولایت کو بسبیل ڈاک لارڈ الن بورا گورنر سابق کی معرفت بھیجا ہے اور اوائل ۱۸۵۶ء میں تین خط انگریزی بواسطۂ انڈیا گورنمنٹ ولایت سے اس کو ڈاک میں آئے ہیں۔ اب ہم ان تینوں خطوط کے خلاصے لکھ کر اس کے ذکر کو ختم کرتے ہیں۔

مذکورۂ بالا تحریر یہ مدیر رسالۂ اردو اورنگ آباد

نے جو رائے ظاہر کی ہے وہ بھی ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

" ان حالات کے پڑھنے سے کم از کم ایک بات تو پکی ہو گئی ہے اگرچہ ان کے کلام اور رقعات میں بھی جا بجا اس کا ذکر آ چکا ہے اور ایک صاحب نے جو مرزا صاحب کی حب وطن اور قوم کی نسبت (جدید خیالات کی رو سے) جو حسن ظن قائم کیا تھا۔ اس کی تردید خود مرزا صاحب کے الفاظ سے ہو جاتی ہے۔"



اشاریہ

تمّت

کلیات اقبال

علامہ اقبال علیہ الرحمہ کا کلام ادبی دنیا میں خصوصیت کے ساتھ بہت اونچا مقام رکھتا ہے اس کے علاوہ ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ الہام ربّانی کی جیتی جاگتی تصویر معلوم ہوتا ہے اُن کا تمام اردو کلام ظاہری و باطنی محاسن کے ساتھ یکجا جمع کر کے شائع کیا گیا ہے۔ صحت کا خصوصی انتظام کیا گیا ہے۔ کتابت و طباعت بہترین،
مجلد مع گرد پوش قیمت
پانچ روپئے (۵)

افضل الشواہد

حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات مرتبہ امیر الشعراء امیر خسروؔ دہلوی نے حضرت والا کی حیات طیبہ میں زبان فارسی میں قلم بند کئے تھے ان ملفوظات کو حضور محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ نے خود قلم بند ہونے کے بعد مطالعہ فرمایا اور درست پایا اس لئے اس شریعت و طریقت کے مجموعہ کو (جو عرصہ سے ناپید تھا) بزبان اردو شائع کیا گیا ہے تاکہ اس کتاب سے زیادہ سے زیادہ حضرات فائدہ اٹھا کر اپنی عاقبت درست کریں۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں ہر دو حصص پوری احتیاط اور جمیع محاسن کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں۔ ہدیہ ہر دو حصہ مجلد معہ گرد پوش پانچ روپے (۵؎)

جذباتِ فطرت

مرتبہ :۔ پروفیسر محمد الیاس ۔ برنی

اردو منظومات کا یہ خوبصورت مجموعہ جس کے انتخاب کا شرف الیاس برنی جیسی نامور شخصیت کو حاصل ہے اپنی افادی حیثیت عام طور پر مسلمہ رکھتا ہے اردو منظومات کی اس قدر اعلیٰ ترتیب جس سے زبانِ اردو کی جواہر ریزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کم دیکھنے میں آئی ہوگی۔ ڈھائی سو صفحات کا یہ مجموعہ بلند پایہ اعلیٰ ترین منظومات کا جاذبِ نظر مرقع ہے جو اردو ادب میں ایک بہترین شاہکار ہے۔ ظاہری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ قیمت

چار روپے (للعہ)

ادب عالیہ

اردو منظومات کا عدیم النظیر نچوڑ جس سے اردو ادب کے بلند معیار کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ پروفیسر محمد الیاس برنی نے مرتب کیا ہے۔ ایک ایک شعر اپنی خوبصورتی اور محاسن کے لحاظ سے ادبی نگینہ معلوم ہوتا ہے۔ اردو ادب کا یہ شاہکار جذباتِ فطرت کا حصہ سوم و چہارم قیمت ہر دو حصص چار روپے۔

کلیاتِ اختر شیرانی

شاعرِ رومان اختر شیرانی مرحوم شعر کی دنیا میں ایک پیغمبری حیثیت رکھتے ہیں ان کے کلام کو یک جا جمع کر کے انتہائی خوبصورتی کے ساتھ ایک جلد میں شایع کیا گیا ہے۔ کتاب اردو شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔ پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔

قیمت مجلد مع گرد پوش آٹھ روپئے (معہ)